۲۔ حضرت یسوعؑ کا دوسرا بڑا معجزہ یہ ہے کہ آپ نے مُردوں کو زندہ کیا تھا۔ چنانچہ انجیل لوقا میں ہے کہ ایک مرتبہ جب حضرت یسوعؑ نائین نام کے ایک شہر کی جانب اپنے شاگردوں اور دوسرے بہت سے لوگوں کے ہمراہ جارہے تھے تو وہاں آپ نے ایک مُردے کو زندہ کیا تھا۔ لوقا نے لکھا ہے ''جب وہ (یسوع) شہر کے پھاٹک کے نزدیک پہنچا تو دیکھا ایک مُردے کو باہر لئے جاتے تھے۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ بیوہ تھی اور شہر کے بہتیرے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اسے دیکھ کر خداوند کو ترس آیا اور اس سے کہا مت رو۔ پھر اس نے پاس آکر جنازے کو چھوا اور اٹھانے والے کھڑے ہوگئے اور اس نے کہا اے جوان، میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ۔ وہ مردہ اٹھ بیٹھا اور بولنے لگا اور اس نے اسے اس کی ماں کو سونپ دیا اور سب پر اس کی دہشت چھا گئی اور وہ خدا کی تمجید کر کے کہنے لگے کہ ایک بڑا نبی ہم میں برپا ہوا ہے اور خدا نے اپنی امت پر توجہ کی ہے اور اس کی نسبت یہ خبر سارے یہودیہ اور تمام گردونواح میں پھیل گئی۔'' (ارج) دیکھئے اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بہ قول لوقا لوگوں پر دہشت چھا گئی تھی۔ انہوں نے اپنے منہ سے حضرت یسوعؑ کے نبی ہونے کا اعتراف کیا لیکن حضرت یسوعؑ نے ہرگز انہیں خبردار نہیں کیا کہ میں نبی نہیں بلکہ میں تو خود خدا کا بیٹا اور خدا ہوں۔ میرے نبی اور رسول تو میرے حواری ہوں گے، پھر پولس میرا رسول ہوگا جو فی الحال مجھے اور میرے ساتھیوں کو شدید ایذا پہنچا رہا ہے۔ یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ جب اس مُردے کے حضرت یسوعؑ کے ہاتھوں دوبارہ زندہ ہونے کی خبر نہ صرف یہودیہ بلکہ اس کے گردونواح میں بھی دور دور تک پھیل گئی تھی تو دیگر تین اناجیل کے مؤلفین متی، مرقس اور یوحنا نے اپنی اناجیل میں اتنی بڑی اور نہایت ہی اہم خبر کو کیوں جگہ نہ دی؟ کیا ان تینوں کی پراسرار خاموشی اس خبر کو مشکوک نہیں ٹھہراتی؟ انصاف پسند عیسائی حضرات خود فیصلہ فرمائیں۔

انجیل یوحنا میں بھی لعزر نام کے ایک مُردے کا حضرت یسوعؑ کے ہاتھوں زندہ ہونے کا حال لکھا گیا ہے۔ یہ شخص مریم مگدلینی اور مرتھا دو بہنوں کا بھائی تھا۔ مریم مگدلینی کی درخواست پر حضرت یسوعؑ نے اسے زندہ کیا تھا۔ چنانچہ انجیل یوحنا میں ہے ''پس انہوں نے (لعزر کی قبر کے) اس پتھر کو ہٹا دیا پھر یسوع نے آنکھیں اٹھا کر کہا اے باپ میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ تو نے میری سن لی اور مجھے تو معلوم تھا کہ تو ہمیشہ میری سنتا ہے مگر ان لوگوں کے باعث جو آس پاس کھڑے ہیں میں نے یہ کہا، تاکہ وہ ایمان لائیں کہ تو نے ہی مجھے بھیجا ہے اور یہ کہہ کر اس نے بلند آواز سے پکارا کہ اے لعزر نکل آ۔ جو قبر میں تھا وہ کفن سے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نکل آیا اور اس کا چہرہ رومال سے لپٹا ہوا تھا۔ یسوع نے ان سے کہا اسے کھول کر جانے دو۔ پس بہتیرے یہودی جو مریم کے پاس آئے تھے اور جنہوں نے یسوع کا یہ کام دیکھا اس پر

ایمان لائے۔ مگر ان میں سے بعض نے فریسیوں کے پاس جا کر انہیں یسوع کے کاموں کی خبر دی۔ (۲/الف) دیکھئے بہ قول یوحنا حضرت یسوعؑ نے اس موقع پر لوگوں کو یہ سمجھانا چاہا کہ خدا ہی نے مجھے بھیجا ہے یعنی میں خدا کا فرستادہ پیغمبر ہوں نہ کہ خود خدا ہوں۔ اور یہ بھی سمجھانا چاہا کہ میں یہ معجزے اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے نہیں دکھا سکتا۔ اس کے لئے مجھے خدا سے دعا اور التجا کرنی پڑتی ہے اور خدا کے حکم سے ہی میں اس طرح کے معجزے دکھا رہا ہوں۔ تاہم یہاں بھی غور طلب امر یہ ہے کہ اتنا بڑا واقعہ جسے دیکھ کر بہ قول یوحنا بہت سے یہودی ایمان لے آئے تھے اور جس کی خبر یہودیوں کے سخت گیر مذہبی لوگوں (فریسیوں) کو بھی پہنچ چکی تھی تو اتنی بڑی خبر اور اتنے بڑے واقعے کو دیگر تینوں اناجیل کے مؤلفین متی، مرقس اور لوقا نے کیوں نظر انداز کر دیا؟ کیا ان تینوں کی معنی خیز خاموشی اس واقعے کو مشکوک نہیں ٹھہراتی؟ انصاف پسند عیسائی حضرات خود ہی فیصلہ فرمائیں۔

ایک سردار کی مُردہ بیٹی کو زندہ کرنے کے واقعے کا ذکر متی، لوقا اور مرقس تینوں نے مختلف انداز میں کیا ہے۔ البتہ تینوں اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت یسوعؑ نے اس لڑکی کو مُردہ قرار نہیں دیا تھا بلکہ یہ فرمایا تھا ''لڑکی مری نہیں بلکہ سوتی ہے۔'' (۲/ب) انجیل مرقس اور لوقا میں حضرت یسوعؑ کے کلمات یوں ہیں ''لڑکی مر نہیں سوتی ہے'' (۲/ج) دیکھئے جب حضرت یسوعؑ خود فرما رہے ہیں کہ لڑکی مری نہیں تھی بلکہ سو رہی تھی تو اس سے مُردے کو زندہ کرنے کا معجزہ تو ثابت نہ ہوا۔

اوپر ہم معلوم کر چکے ہیں کہ لوقا نے نائین شہر کے پھاٹک پر ایک مُردے کو زندہ کرنے اور یوحنا نے مریم مگدلینی کے مُردہ بھائی لعزر کو زندہ کرنے کے حضرت یسوعؑ کے معجزے کا ذکر کیا ہے لیکن باقی اناجیل اس سلسلے میں حیرت انگیز طور پر خاموش ہیں پھر اس سے بھی زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ لوقا اور یوحنا نے مُردوں کو زندہ کرنے کے حضرت یسوعؑ کے اس معجزے کو ثابت کرنے کی جو تھوڑی بہت محنت کی تھی اس پر بھی عیسائیوں کے مقدس پولس نے پوری طرح پانی پھیر دیا۔ چنانچہ بہ مطابق کتاب اعمال پولس کہتا ہے ''لیکن خدا کی مدد سے میں آج تک قائم ہوں اور چھوٹے بڑے کے سامنے گواہی دیتا ہوں اور ان باتوں کے سوا کچھ نہیں کہتا جن کی پیشین گوئی نبیوں اور موسیٰ نے بھی کی ہے کہ مسیح کو دکھ اٹھانا ضرور ہے اور سب سے پہلے وہی مُردوں میں سے زندہ ہو کر اس امت کو اور غیر قوموں کو بھی نور کا اشتہار دے گا''۔ (۳/الف) اگر بہ قول پولس حضرت یسوعؑ مُردوں میں سے سب سے پہلے زندہ ہونے والے ہیں اور اگر نبیوں اور حضرت موسیٰؑ نے واقعی ایسی ہی کوئی پیشین گوئی فرمائی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ حضرت یسوعؑ سے پہلے کبھی کوئی مُردہ زندہ ہی نہیں ہوا، لہٰذا حضرت یسوعؑ کا مُردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ کیسے

ثابت ہوگا؟ اور اگر یہ حضرت موسیٰ اور دیگر انبیاء پر بہتان ہے تو پولس عیسائیوں کے لئے مقدس کیسے ہو گیا؟ نئے عہد نامے میں موجود اس کے اقوال اور خطوط الہامی اور مقدس کیسے سمجھ لئے گئے؟ کرنتھیوں کے نام خط میں پولس لکھتا ہے ''مسیح مردوں میں سے جی اٹھا ہے اور جو سو گئے ہیں ان میں پہلا پھل ہوا۔'' (۳/ب) دیکھئے پولس یہاں بھی یہ کہہ رہا ہے کہ حضرت یسوع مسیح مُردوں میں سے سب سے پہلے زندہ ہوئے ہیں یعنی اس سے پہلے بہ قول پولس کوئی مردہ کبھی زندہ ہوا ہی نہیں۔ کیا اس سے مُردوں کو زندہ کرنے کے حضرت یسوعؑ کے معجزے کی بھرپور نفی نہیں ہوگئی؟ اس سے پریشان ہو کر بائبل کے جدید انگریزی ترجمے گڈ نیوز بائبل میں مذکورہ عبارت پر تحریف کی بھرپور مشق کرتے ہوئے اور ہاتھ کی شاطرانہ صفائی دکھاتے ہوئے متن یوں کر دیا گیا ہے:

"But the truth is that Christ has been raised from death, as the guarrantee that those who sleep in death will also be raised." (۳/ج)

سچ تو یہ ہے کہ مسیح کو موت سے (دوبارہ زندہ کر کے) کھڑا کر دیا گیا ہے تا کہ اس امر کی ضمانت فراہم ہو سکے کہ جو لوگ موت کی نیند سو رہے ہیں، وہ بھی (زندہ کر کے) کھڑے کئے جائیں گے۔

غور کیجئے انگریزی متن میں کس ہوشیاری اور چالاکی سے یہ مضمون حذف کر دیا گیا ہے کہ حضرت یسوعؑ مُردوں میں سے سب سے پہلے جی اٹھے ہیں'' یہاں یہ دل چسپ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی حضرت یسوعؑ نے بہ مطابق اناجیل مُردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ لوگوں کو دکھایا تو اس وقت ان لوگوں کو یہ ضمانت کیوں نہ فراہم ہو سکی تھی کہ خدا سب ہی مُردوں کو زندہ کرے گا؟ کاش تحریف کے لئے مضمون تراشتے وقت انگریزی بائبل کے مؤلفین مناسب سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے!'' یہی پولس کلسیوں کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے: ''وہی (یسوع) ابتدا ہے اور مُردوں میں سے جی اٹھنے والوں میں پہلوٹھا، تا کہ سب باتوں میں اس کا اول درجہ ہو''۔ (۴/الف) دیکھئے، یہاں بھی پولس بغیر کسی ابہام کے نہایت کھل کر بات کر رہا ہے کہ یسوع ''مُردوں میں سے جی اٹھنے والوں میں پہلوٹھا'' ہے۔ یہاں پھر ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہوئے گڈ نیوز بائبل کا انگریزی متن یوں کر دیا گیا ہے

He is the first born son, who was raised from death in order that he alone might have the first places in all things (۴/ب)

وہ (یسوع) سب سے پہلا پیدا ہونے والا بیٹا ہے جو موت سے (زندہ کرکے) اٹھایا گیا تاکہ صرف وہی تمام چیزوں میں پہلا مرتبہ حاصل کرے۔

اس انگریزی متن میں بھی مُردوں میں سے حضرت یسوعؑ کے پہلے پہل اٹھنے اور زندہ ہونے کی بات کو بڑی چالاکی سے الجھا دیا گیا ہے۔ لیکن اس تحریف سے بھی عیسائیوں کا کام نہیں چل سکتا۔ نئے عہدنامے میں شامل کتاب ''مشاہداتِ یوحنا'' میں ہے:

اور یسوع مسیح کی طرف سے سچا گواہ اور مُردوں میں سے جی اٹھنے والوں میں پہلوٹھا۔ (۴/ج)

دیکھئے، یہاں بھی حضرت یسوعؑ کو ''مُردوں میں سے جی اٹھنے والوں میں پہلوٹھا'' قرار دیا گیا ہے یعنی اس سے پہلے کوئی مُردہ کبھی زندہ ہوا ہی نہیں۔ بالفاظِ دیگر حضرت یسوعؑ کے ہاتھوں مُردوں کے زندہ ہونے کے معجزے کی مکمل اور بھرپور نفی ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی بائبل کے مؤلفین کو بار بار تحریف کرتے ہوئے کچھ شرمندگی لاحق ہوئی۔ اس لئے یہاں انگریزی متن میں تحریف نہیں کی گئی۔ یہ متن یوں ہے:

"And from Jesus Christ, the first to be raised from death."

(۵/الف)

یسوع مسیح کی طرف سے، جو مُردوں میں سے سب سے پہلے جی اٹھنے والا ہے۔

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بائبل کے مؤلفین اس طرح کے مضامین میں تحریف کرتے ہوئے از راہِ احتیاط سب ہی متعلقہ عبارتوں میں ایک ہی وقت میں یک لخت تحریف نہیں کرتے تاکہ اگر لوگ چند عبارتوں میں ان کی تحریف کو برداشت کرلیں تو بعد میں موقع ملنے پر مناسب وقت پر دیگر متعلقہ عبارتوں میں بھی چپکے سے تحریف کردی جائے۔ وہ اپنی اس عادت سے مجبور نظر آتے ہیں۔ ہم اہل اسلام مُردوں کو زندہ کرنے کے حضرت عیسیٰؑ کے معجزے کو قرآن کریم کی روشنی میں تسلیم کرتے ہیں نہ کہ محرّف بائبل کے (جھوٹے) مضامین سے ان کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔

۳۔ بہ مطابق اناجیل حضرت یسوعؑ نے اپنے مخالفین کو یہ نشانی دکھانے کا وعدہ فرمایا تھا کہ میں یوناہ (یونسؑ) کی طرح قبر میں تین دن اور تین رات تک رہوں گا، پھر دوبارہ جی اٹھوں گا۔ لیکن اناجیل کے مضامین کے مطابق حضرت یسوعؑ اپنی مبینہ مصلوبیت کے بعد ہرگز تین دن اور تین رات تک قبر میں نہیں رہے بلکہ یہ مدت صرف ایک دن اور دو رات بنتی ہے۔ اس سلسلے میں عیسائیوں نے تحریف کی جو ناکام کوشش کی ہے، اسے ہم ''مبینہ مصلوبیتِ مسیح'' کے عنوان کے تحت واضح کر چکے ہیں۔ (۵/ب) یہاں تحریف کا اور ثبوت بھی ہمارے سامنے آیا ہے۔ انجیل لوقا میں ہے کہ حضرت یسوعؑ کی مبینہ مصلوبیت اور

تدفین کے بعد ہفتہ کے پہلے دن یعنی اتوار کو علی الصبح جو خواتین آپ کی قبر پر پہنچی تھیں تو دو شخص براق پوشاک پہنے ان کے پاس آ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ان خواتین سے کہا ''وہ یہاں نہیں، بلکہ جی اٹھا ہے۔ یاد کرو جب وہ گلیل میں تھا تو اس نے تم سے کہا تھا ضرور ہے کہ ابن آدم گناہ گاروں کے ہاتھ میں حوالے کیا جائے اور مصلوب ہو اور تیسرے دن جی اٹھے۔'' (۵/ج) دیکھئے یہاں اردو بائبل میں ''تیسرے دن جی اٹھے'' کے کلمات لائے گئے ہیں لیکن گڈ نیوز بائبل میں ہے:

and three days later rise into life.

دیکھئے یہاں جو کلمات لائے گئے ہیں ان کا صحیح ترجمہ اردو زبان میں ''تیسرے دن'' نہیں بلکہ ''تین دن کے بعد'' بنتا ہے۔ پولس کرنتھیوں کے نام خط میں لکھتا ہے ''مسیح کتاب مقدس کے مطابق ہمارے گناہوں کے لئے موا اور دفن ہوا اور تیسرے دن کتاب مقدس کے مطابق جی اٹھا''۔ (۶/الف) یہاں بھی گڈ نیوز بائبل کے انگریزی متن میں متعلقہ کلمات یوں ہیں:

and that he was raised to life three days later.(۶/ب)

یہاں بھی three days later کا اردو میں صحیح ترجمہ ''تیسرے دن'' نہیں بلکہ ''تین دن کے بعد'' بنتا ہے۔ یعنی بائبل کے اردو اور انگریزی تراجم کے مؤلفین تحریف کرتے ہوئے یک جا نہ ہو سکے اور نہ ہی ایک دوسرے سے مشورہ کر سکے۔ جس طرح بائبل کے (محرّف) مضامین کی رو سے حضرت یسوعؑ کا قبر میں پورے تین دن اور تین رات تک رہنے کا مبینہ وعدہ ہرگز پورا نہیں ہوا تو یہ وعدہ بھی ہرگز پورا نہیں ہوا کہ مبینہ مصلوبیت کے بعد قبر میں تین دن پورے کرنے پر آپ زندہ ہو کر اپنے مخالفین کے سامنے برملا ظاہر ہوئے ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر مخالفین کو کیسے علم ہو سکتا تھا کہ آپ تین دن اور تین رات قبر میں گزارنے کے بعد دوبارہ جی اٹھے تھے؟ ان سب امور کی وضاحت ہم عقیدۂ آخرت کے ذیلی عنوان ''مغفرتِ ذنوب'' کے تحت کر چکے ہیں۔ (۶/ج)

الغرض حضرت یسوعؑ کا دوبارہ جی اٹھنے کا معجزہ بھی اناجیل کی رو سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ پانی کو شراب میں تبدیل کر دینے کے حضرت یسوعؑ کے معجزے کا ذکر صرف انجیل یوحنا میں ہے۔ حالانکہ یہ حضرت یسوعؑ کا (مبینہ طور پر) پہلا معجزہ تھا جو ان کی بزرگی کے ظاہر ہونے اور بہت سے لوگوں کے ایمان لانے کا سبب بنا تھا (۷/الف) باقی تینوں اناجیل میں اس معجزے کا ذکر تک نہیں ہے، لہٰذا یہ بھی مشتبہ ہو کر رہ گیا۔

۵۔ یروشلم کے بیت صید میں بیمار کو اچھا کر دینے کا واقعہ بھی صرف انجیل یوحنا میں ہے حالانکہ یہ شخص

لگاتار اڑتیس برس سے بیمار چلا آرہا تھا (۷/ب) دیگر اناجیل کے مؤلفین کا ایسے اہم معجزے کو نظر انداز کرنا اسے مشکوک ٹھہرا رہا ہے۔

۶۔ دس کوڑھیوں کو صحت یاب کرنے کے اہم معجزے کا ذکر صرف لوقا نے کیا ہے۔ (۷/ج)

۷۔ بہ مطابق انجیل متی حضرت یسوعؑ جب یریحو سے نکلے تو راہ میں دو اندھوں کو بیٹھے دیکھ کر انہیں اندھے پن سے شفا بخشی لیکن بہ مطابق انجیل مرقس راہ کے کنارے بیٹھا ایک ہی اندھا فقیر تھا جو تمائی کا بیٹا برتمائی تھا جسے یسوعؑ نے ٹھیک کیا تھا (۸/الف) یوں اناجیل کے اختلاف نے اندھوں کو شفا بخشنے کے حضرت یسوعؑ کے اس معجزے کو بھی مشکوک بنا کر رکھ دیا۔

۸۔ بہ مطابق انجیل مرقس حضرت یسوعؑ جب گلیل کی جھیل پر پہنچے تو آپ نے صرف ایک ہی شخص کو شفا دی جو بہرہ اور گونگا تھا، جب کہ بہ مطابق انجیل متی لنگڑوں، اندھوں، گونگوں، ٹنڈوں اور بہت سے اور بیماروں کی ایک بڑی تعداد کو لوگ حضرت یسوعؑ کے پاس لائے تھے اور وہ آپ کے ہاتھوں شفایاب ہوئے تھے، حالانکہ واقعہ ایک ہی ہے۔ (۸/ب) یہاں بھی ہر دو اناجیل کے اختلاف نے حضرت یسوعؑ کے ہاتھوں معجزانہ شفا بخشی کے ان واقعات کو بھی مشتبہ کر دیا۔

۹۔ بہ مطابق انجیل متی حضرت یسوعؑ جب گدرینیوں کی بستی کی طرف آئے تو آپ کی ملاقات دو بدروحوں والے مُردوں سے ہوئی تھی جو قبروں سے نکل رہے تھے اور آپ نے ان دونوں کو شفا دی لیکن بہ مطابق اناجیل مرقس ولوقا، بدروح والا ایک ہی دیوانہ تھا جسے آپ نے شفایاب کیا تھا (۸/ج) بہ مطابق انجیل متی اپنی بیٹی کی شفایابی کے لئے حضرت یسوعؑ سے فریاد کرنے والی عورت کنعانی تھی۔ اس کی بیٹی کو حضرت یسوعؑ نے ایک بدروح سے نجات دلائی تھی لیکن بہ مطابق انجیل مرقس یہ عورت بہ لحاظ قوم یونانی اور بہ لحاظ خاندان سورفینیقی تھی (۹/الف) یہاں بھی اناجیل کے اختلاف نے بدروحیں نکالنے کے حضرت یسوعؑ کے معجزے کو مشکوک ٹھہرا دیا ہے۔ الغرض حضرت یسوعؑ کے تمام اہم معجزات کو اناجیل اور ملحقہ کتب کے متضاد مضامین نے مشتبہ کر دیا۔ بلکہ بعض معجزات مثلاً حضرت یسوعؑ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے اور مُردوں کو زندہ کرنے کی بھرپور نفی ان (محرّف) کتابوں سے ہو رہی ہے۔ اس سلسلۂ مضامین میں ہم قبل ازیں متعلقہ مضامین میں ثابت کر چکے ہیں کہ موجودہ (محرّف) اناجیل سے حضرت یسوعؑ کو ہرگز سچا مسیح ثابت نہیں کیا جا سکتا (۹/ب) اور عیسائی حضرات حضرت یسوعؑ کے مقرر کردہ ایمانی معیار کے مطابق اپنے اندر رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ثابت نہیں کر سکتے۔ وہ ان اناجیل کی رو سے ہرگز اپنے لئے جنت کا استحقاق بھی ثابت نہیں کر سکتے (۹/ج) ان حالات میں موجودہ محرّف عیسائیت کو عالمی مذہب قرار

دینا اور عیسائیت کو قبول کرنے کی لوگوں کو دعوت دینا قطعاً لایعنی اور خارج از بحث قرار پاتا ہے۔ ان (محرّف) اناجیل سے حضرت یسوعؑ کے معجزات بھی یقین واعتماد کے ساتھ ثابت نہیں کئے جاسکتے۔ ان تمام امور کے لئے ہمارے مسیحی بھائی قرآن کریم کا سہارا لینے کے محتاج ہیں۔ چنانچہ سب کو حضرت یسوعؑ کے معجزات کو کماحقہ ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا، جو اختلافات و تضادات کے عیب سے قطعاً پاک، غیر محرّف اور محفوظ آسمانی کتاب ہے۔ تعجب ہے کہ اس کے باوجود عیسائی حضرات قرآن کریم کا انتہائی ممنون اور شکر گزار ہونے کی بہ جائے اس کے انکار اور اس سے عداوت کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں اور قرآن کریم سے ثابت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ نے معجزات نہیں دکھائے۔

حضرت عیسیٰؑ (یسوع) کے متعلق قرآن کریم میں مثلاً سورۂ آل عمران میں ہے کہ (وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب فرشتوں نے (مریم سے) کہا کہ اے مریم! اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے۔ جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے جو دنیا اور آخرت میں باوقار اور میرے مقرب بندوں میں سے ہے۔ وہ لوگوں سے گہوارے میں باتیں کرے گا اور بڑی عمر میں بھی، اور وہ نیک لوگوں میں سے ہوگا۔ (مریم نے) کہا اے میرے پروردگار، میرے لڑکا کیسے ہوگا؟ حالانکہ مجھے تو کسی انسان نے ہاتھ بھی نہیں لگایا (فرشتے نے) کہا اسی طرح، اللہ جو چاہے ہوا کرتا ہے۔ جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہوجا، تو وہ ہوجاتا ہے (۱۰/الف) چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کا بغیر باپ کے حمل حضرت مریمؑ کو اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُن یعنی ''ہوجا'' سے ہوگیا۔ اسی لئے انہیں کلمۃ اللہ کہا جاتا ہے۔ اور اسی سورۂ آل عمران میں ہے کہ: (عیسیٰ) بنی اسرائیل کے لئے رسول ہوگا۔ (اور ان سے کہے گا کہ) میں تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانی لایا ہوں۔ میں تمہارے لئے پرندے کی شکل کی طرح مٹی کا پرندہ بناتا ہوں۔ پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو ٹھیک کرتا ہوں اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو تم اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو میں تمہیں بتادیتا ہوں۔ (میرے) ان (معجزات) میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے۔ اگر تم ایمان لانے والے بنو اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور میں اس لئے آیا ہوں کہ تم پر بعض وہ چیزیں حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کردی گئی تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانی لایا ہوں۔ اس لئے تم اللہ سے ڈرو اور میری فرماں برداری کرو۔ بے شک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، تم اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔ (۱۰/ب)

اور مثلاً سورۂ مائدہ میں حضرت عیسیٰؑ کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا اس کا ایک حصہ یہ ہے کہ: (اے عیسیٰ بن مریم وہ وقت یاد کر) جب تو میرے حکم سے مٹی سے پرندے کی صورت کی طرح (پرندہ) بناتا تھا پھر تو اس میں پھونک مارتا تھا تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا اور تو مادرزاد اندھے اور سفید داغ والے کو میرے حکم سے ٹھیک کرتا تھا اور جب تو میرے حکم سے مُردوں کو زندہ کرتا تھا اور جب میں نے بنی اسرائیل (کے ہاتھوں) کو تجھ سے روک دیا جب تو ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا تو ان میں سے جنہوں نے کفر کیا، کہنے لگے کہ یہ تو صریح جادو ہے (۱۰/ج)

اور مثلاً سورۂ مریم میں ہے کہ (لوگوں کے شور وغوغا اور اعتراض پر حضرت مریم صدیقہؑ نے) اس (عیسیٰ) کی طرف اشارہ کیا تو وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم اس سے جو گود کا بچہ ہے، کیسے بات کریں؟ (بچہ) بول اٹھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے (یعنی قضاوقدر میں اللہ نے مجھے نبوت اور کتاب عطا فرمانے کا فیصلہ کر رکھا ہے)۔ (۱۱/الف)

قرآن کریم کے مضامین میں کسی طرح کا تضاد اور اختلاف نہیں جس سے حضرت عیسیٰؑ کے لئے قرآن کریم میں مذکور یہ معجزات لوگوں پر مشتبہ ہو کر رہ جائیں (۱۱/ب) الغرض حضرت عیسیٰؑ کے معجزات قرآن کریم کا سہارا لئے بغیر اناجیل کے متضاد مضامین کی وجہ سے کما حقہ ثابت ہی نہیں ہوتے نیز بہ مطابق بائبل یہ معجزات حضرت یسوعؑ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ اگر حضرت یسوعؑ نے بہ مطابق اناجیل دو مُردے زندہ کئے تو پرانے عہدنامے کی کتاب حزقی ایل کے مطابق حضرت حزقی ایلؑ نے ہزاروں مردوں کو زندہ کیا تھا (۱۱/ج) بیماروں کو ٹھیک کرنے کا معجزہ بھی حضرت یسوعؑ کے ساتھ خاص نہیں۔ حضرت الیسعؑ نے نعمان نام کے ایک کوڑھی سپہ سالار کو شفا بخشی تھی اور ایک بلکہ کئی نابیناؤں کو بھی ٹھیک کیا تھا (۱۲/الف) تھوڑے کھانے کو بڑھا دینے کا معجزہ بھی حضرت یسوعؑ کے لئے مخصوص نہیں۔ یہ کام حضرت ایلیاہ (الیاسؑ) نے حضرت یسوعؑ سے بھی بڑھ کر کیا تھا کہ انہوں نے مٹھی بھر آٹے اور تھوڑے سے تیل کو اتنا بڑھا دیا کہ وہ سال بھر تک ختم نہ ہوا۔ (۱۲/ب) حضرت یسوعؑ کا ایک معجزہ یہ ہے کہ آپ کشتی کے بغیر دریا پر چلے لیکن حضرت موسیٰؑ کا معجزہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ ان کی لاٹھی سے سمندر دو حصوں میں بٹ گیا اور درمیان میں خشک راستہ بن گیا، جہاں سے بنی اسرائیل نے سمندر کو پار کیا جب کہ فرعون اور اس کے ساتھی اس راستے پر چلے تو پانی دوبارہ آپس میں مل گیا اور انہیں غرق کر دیا (۱۲/ج) لہٰذا ان معجزات سے عیسائی حضرات کا حضرت یسوعؑ کی الوہیت (خدائی) ثابت کرنا قطعاً باطل ہے۔ ان تمام امور کو ہم زیر عنوان ''الوہیت مسیح اور بائبل'' بخوبی واضح کر چکے ہیں۔ (۱۳/الف)

بائبل اور قرآن دونوں سے ثابت ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام خدا کی مرضی کے پابند ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھوں معجزات کا ظہور بھی خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اناجیل سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت یسوعؑ کو معجزات دکھانے پر از خود قدرت حاصل نہ تھی۔ چنانچہ انجیل یوحنا میں ہے ''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ بیٹا (یسوع) آپ سے کچھ نہیں کرسکتا، سوا اس کے جو باپ (خدا) کو کرتے دیکھتا ہے کیونکہ جن کاموں کو وہ کرتا ہے، انہیں بیٹا بھی اسی طرح کرتا ہے۔'' (۱۳ر ب) نیز اسی انجیل میں ہے ''.....میں وہی ہوں اور اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا بلکہ جس طرح باپ نے مجھے سکھایا اسی طرح یہ باتیں کہتا ہوں اور جس نے مجھے بھیجا ہے وہ میرے ساتھ ہے۔ اس نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا کیونکہ میں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں جو اسے پسند آتے ہیں۔'' (۱۳ر ج) اور اسی انجیل میں لعزر نام کے مُردے کو زندہ کرنے کا منظر یوں دکھایا گیا ہے ''پھر یسوع نے آنکھیں اٹھا کر کہا اے باپ میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ تو نے میری سن لی اور مجھے تو معلوم تھا کہ تو ہمیشہ میری سنتا ہے مگر ان لوگوں کے باعث جو آس پاس کھڑے ہیں، میں نے یہ کہا تا کہ وہ ایمان لائیں کہ تو ہی نے مجھے بھیجا ہے۔'' (۱۴ر الف) دیکھئے انجیل یوحنا کے ان مضامین کے مطابق حضرت یسوعؑ نے واشگاف الفاظ میں اپنے آپ کو خدا کی مرضی پر چلنے والا اس کا فرماں بردار بندہ اور اس کا ایسا نبی ظاہر کیا ہے جو معجزات اپنی مرضی سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی سے دکھانے کا پابند ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ لوگوں کو ان کے منہ مانگے معجزات لازماً دکھائے جائیں، چنانچہ انجیل مرقس میں ہے ''پھر فریسی نکل کر اس سے بحث کرنے لگے اور اسے آزمانے کے لئے اس سے کوئی آسمانی نشان طلب کیا۔ اس نے اپنی روح میں آہ کھینچ کر کہا اس زمانے کے لوگ کیوں نشان طلب کرتے ہیں؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان نہ دیا جائے گا۔'' (۱۴ر ب) ادھر قرآن کریم میں مثلاً سورۂ انعام میں ہے کہ یہ لوگ اللہ کی پختہ قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آجائے تو وہ ضرور اس پر ایمان لے آئیں گے (اے پیغمبر) تو کہہ دے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور (اے مسلمانو!) تمہیں کیا خبر کہ اگر نشانیاں آ بھی جائیں تو بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ (۱۴ر ج) اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضروری نہیں کہ مخالفین کو ان کے منہ مانگے معجزات دکھائے جائیں اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ یہ معجزات ان کے ایمان لانے کا سبب بنیں۔ لہٰذا اہل کتاب کا یہ اعتراض قطعاً لغو ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم معجزات دکھانے پر قادر نہ تھے، کیونکہ خدا کی مرضی کے بغیر حضرت یسوعؑ بھی معجزات نہیں دکھا سکتے تھے جیسا کہ اناجیل اور قرآن کریم کے متعلقہ تقابل سے واضح ہو چکا ہے۔

قرآن کریم سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد عظیم الشان معجزات ثابت ہیں۔ سورۂ قمر میں ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ O وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ O (۱۵/الف)

قیامت نزدیک آ گئی اور چاند پھٹ گیا اور اگر وہ (مخالفین) کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو ہمیشہ کا جادو ہے۔

یہ وہ معجزہ ہے جو مکے والوں کو دکھایا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشت مبارک کے اشارے سے چاند دو حصوں میں بٹ گیا اور لوگوں نے حرا پہاڑ کو ان ٹکڑوں کے درمیان دیکھا (۱۰/ب) علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ اہل علم کا اس پر مکمل اتفاق ہے کہ چاند کے پھٹنے کا یہ معجزہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور میں ہوا اور صحیح اسناد سے ثابت احادیثِ متواترہ اس کی تائید میں موجود ہیں۔ یہاں آیت میں اقتربت اور انشق دونوں ماضی کے صیغے ہیں۔ ماضی کا مستقبل کے معنی میں استعمال مجاز ہے اور حقیقی معنی بغیر کسی قوی قرینے کے چھوڑ کر مجازی معنی نہیں لیا جا سکتا۔ ماضی کے صیغے سے اگر ماضی کا معنی لینا عقلاً محال ہو تو مستقبل کا معنی لیا جائے گا اور یہاں ایسی کوئی صورت نہیں ہے۔ نیز مخالفین کی طرف سے کسی نشانی کا انکار کر دینا اور اسے جادو قرار دینا تب ہی ہوا کرتا ہے جب مخالفین کے سامنے ایسی نشانی دکھانے کا کوئی مدعی ہو۔ قیامت کے انتہائی متصل جو بڑی بڑی نشانیاں سب ہی پر ظاہر ہوں گی وہ تو ہر کسی کو نظر آ جائیں گی۔ ان کے انکار اور انہیں جادو قرار دینے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہوگی۔

دنیا بھر میں وقت یک ساں نہیں ہوا کرتا۔ مکہ مکرمہ میں جب رات ہو تو دنیا کے بہت سے ممالک میں دن کا وقت ہوتا ہے اور جہاں رات کا وقت ہو تو وہ بھی مکے کے مقامی وقت سے خاصا مقدم و مؤخر ہو سکتا ہے۔ بہت سے مقامات پر فضا ابر آلود یا غبار آلود ہو سکتی ہے۔ انشقاقِ قمر کے اس معجزے سے پہلے دنیا بھر کے لوگوں کو اس کے ظہور کے وقت کی بلکہ ظہور کی بھی اطلاع نہیں دی گئی تھی کہ وہ اس کے انتظار میں چاند کو دیکھتے رہتے۔ نیز کسی بڑے واقعے کا دنیا بھر کی کتب میں مذکور ہونا قطعاً ضروری نہیں۔ مثلاً طوفانِ نوح بائبل کی رو سے عالم گیر طوفان تھا لیکن چین اور ہندوستان وغیرہ کی قدیم تاریخی کتب میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ بہ مطابق بائبل، حضرت یوشعؑ نے سورج اور چاند کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اے سورج، تو جبعون پر اور اے چاند تو وادی ایالون میں ٹھہرا رہ اور سورج ٹھہر گیا اور چاند بھی تھما رہا۔ جب تک قوم نے اپنے دشمنوں سے اپنا انتقام نہ لے لیا۔ کیا یہ آشر کی کتاب میں نہیں لکھا ہے؟ اور سورج آسمان کے بیچوں بیچ ٹھہرا رہا اور تقریباً سارے دن ڈوبنے میں جلدی نہ کی اور ایسا دن نہ کبھی اس سے پہلے ہوا اور نہ اس کے بعد۔ جس میں خداوند نے کسی آدمی کی بات سنی ہو کیونکہ خداوند اسرائیلیوں کی خاطر لڑا۔'' (۱۵/ج)

دیکھئے بائبل میں مذکور اتنے عظیم الشان اور دن بھر کے طویل دورانئے پر مشتمل اتنے حیرت انگیز معجزے کا دنیا کی قدیم تاریخی کتب میں نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ پس شق قمر کے مختصر وقت کے معجزے پر اہل کتاب کے اس طرح کے اشکالات کالعدم ہیں۔

غزوۂ بدر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں کی ایک مٹھی کفار کی طرف پھینکی جسے اللہ تعالیٰ نے سب کفار کے چہروں اور آنکھوں تک پہنچادیا۔ جس سے انہیں کچھ دکھائی نہ دیا اور بالآخر وہ شکست سے دوچار ہوئے۔ چنانچہ سورۂ انفال میں ہے:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۱۶/الف)

اور (اے پیغمبر) تو نے (کنکریوں کی) مٹھی نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔

یعنی یہ معجزہ اللہ کی طرف سے آپ کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (۱۶/ب)

وہ (اللہ ہر عیب اور کم زوری سے) پاک ہے جو اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک لے گیا جس کے اردگرد ہم نے برکت رکھی ہے تاکہ ہم اسے اپنی (قدرت) کی نشانیاں دکھائیں۔

اس آیت، سورۂ نجم کی بعض آیات اور صحیح احادیث سے بہ خوبی واضح ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ حالتِ بیداری جسمانی معراج حاصل ہوئی۔ آیت مذکورہ میں لفظ عبد بہ معنیٰ بندہ معراج کے جسمانی ہونے پر بڑی محکم دلیل ہے کیونکہ عبد کا لفظ جسم اور روح دونوں کے مجموعے پر بولا جاتا ہے۔ آیت میں ''سبحان'' بہ معنیٰ ''پاک ہے'' کا لفظ بھی معراج کے جسمانی ہونے کو ظاہر کررہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب، کم زوری، عاجزی اور بے بسی سے پاک ہے۔ اس لئے اسے پوری قدرت حاصل ہے کہ وہ جسے چاہے اور جب چاہے جسم اور روح سمیت دور دراز کے فاصلے تھوڑے سے وقت میں طے کرادے اور جسے چاہے آسمانوں پر لے جائے جیسے بہ مطابق بائبل اللہ تعالیٰ حضرت ایلیاہؑ کو آسمان پر لے گیا۔ (۱۶/ج) اسی طرح اس نے حضرت عیسیٰؑ کو بھی زندہ اپنی طرف اٹھالیا۔ (۱۷/الف) عجیب وغریب خواب تو لوگ دیکھتے ہی رہتے ہیں اور ایسے خوابوں کا لوگ انکار بھی نہیں کیا کرتے۔ آپ کے مخالفین قریش مکہ نے آپ کی جسمانی معراج کا انکار اسی لئے تو کیا تھا کہ انہیں اس معراج کے جسمانی ہونے کا بتایا گیا تھا۔ بعض روایات سے معراج کا جو منامی (خواب کا واقعہ) ہونا معلوم ہوتا ہے وہ جسمانی معراج کے خلاف نہیں کیونکہ رسول

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانوں پر جسمانی معراج کے بعض مناظر خواب میں بھی دکھائے گئے تھے، یعنی آپ کو خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں معراج حاصل ہوا۔ چونکہ عیسائی حضرات اناجیل کے مضامین سے حضرت یسوعؑ کے اہم معجزات خصوصاً مُردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ قطعیت اور بھرپور اعتماد سے ثابت ہی نہیں کر سکتے، لہٰذا اس سلسلے میں وہ قرآن کریم کی طرف رجوع کرنے اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے پر مجبور ہیں، جس میں حضرت یسوعؑ کے بعض ایسے معجزات مثلاً گہوارے میں کلام کرنا وغیرہ بھی مذکور ہیں جن کے ذکر سے اناجیل اور ملحقہ کتب خالی ہیں۔ جب وہ قرآن کریم میں مذکور حضرت عیسیٰ (یسوع) کے معجزات کو مانیں گے تو لامحالہ پورے قرآن پر ایمان لانے کے پابند ہوں گے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو معجزات قرآن کریم میں آئے ہیں، انہیں بھی تسلیم کرنا ہوگا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاصی بڑی تعداد میں حسّی معجزات دیئے گئے ہیں جن کا تفصیلی ذکر سیرت اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے اور ہر روایت کا پورا سلسلۂ سند بھی دیا گیا ہے۔ اس لئے ان کے صحیح ہونے کا معیار بائبل کی کتب سے نہایت بلند و بالا ہے۔ بائبل کی تو سرے سے کوئی متصل سند ہی نہیں۔ یہاں صرف بائبل اور قرآن کا تقابل مقصود ہے۔ اس لئے ہم ان معجزات کا ذکر یہاں نہیں کر رہے۔ جہاں تک واقعاتِ سیرت سے متعلق بعض اہم معجزات کا تعلق ہے، وہ ہم متعلقہ واقعات و حوادث کے ضمن میں بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا اور زندہ معجزہ تو خود قرآن کریم ہے۔ یہ آپ کا علمی معجزہ ہے جس کی وجوہِ اعجاز کو ہم زیر بحث لا رہے ہیں اور ان سطور کے لکھنے تک ابھی اس کی معجزانہ حیثیت بہ لحاظ اخبار عن المغیبات (غیبی خبریں دینے) کی چل رہی ہے۔ آپ کا یہ معجزہ تمام حسّی معجزات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے رب کی طرف سے ہمارے پاس کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں لاتا؟ کیا ان کے پاس (اس قرآن کے ذریعے) ان کے صحیفوں کی تعلیمات کا واضح بیان آنہیں چکا ہے؟'' (۱۷/ب) یعنی یہ بہ ذاتِ خود بہت بڑا معجزہ ہے کہ ایک امّی شخص پر ایسی کتاب نازل ہوئی ہے جس نے گزشتہ آسمانی کتب کے غیر محرّف اور صحیح مضامین کا نچوڑ اور امم سابقہ کے حالات لوگوں کے سامنے رکھ دیئے ہیں اور اس نے حال اور مستقبل کی بھی صحیح خبریں پیش کر دی ہیں، جنہیں نہ جھٹلایا جا سکا ہے اور نہ آئندہ انہیں کوئی جھٹلا سکتا ہے۔

۸۔ نسخِ احکام

قرآن کریم سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے اپنے بعض احکام کو منسوخ یا انہیں تبدیل کر

دیتا ہے۔ احکام کی منسوخی کے قرآنی تصور پر اہل کتاب کے بے جا اعتراضات کو زیر بحث لانے سے پہلے ہم انہیں بائبل کے متعلقہ مضامین یاد دلانا چاہتے ہیں۔ کتاب پیدائش میں حضرت ابراہیمؑ کا اپنی اہلیہ محترمہ حضرت سارہؓ کے متعلق قول یوں مذکور ہے: ''اور فی الحقیقت وہ میرے باپ کی بیٹی ہے۔ اگرچہ میری ماں کی بیٹی نہیں، پھر وہ میری بیوی ہوئی''۔ (۱۷/ج)

یعنی بہ مطابق بائبل حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں باپ شریک (علاتی) بہن سے نکاح درست تھا لیکن شریعت موسوی میں ایسے نکاح کو حرام کر دیا گیا، چنانچہ کتاب احبار میں ہے: ''تو اپنی بہن کے بدن کو چاہے وہ تیرے باپ کی بیٹی ہو، چاہے تیری ماں کی اور خواہ وہ گھر میں پیدا ہوئی ہو، خواہ اور کہیں، بے پردہ نہ کرنا''۔ (۱۸/الف) کتاب استثناء میں ہے: ''لعنت اس پر جو اپنی بہن سے مباشرت کرے۔ خواہ وہ اس کے باپ کی بیٹی ہو اور خواہ ماں کی، اور سب لوگ کہیں، آمین''۔ (۱۸/ب)

موسوی شریعت میں بہن کے بدن کو بے پردہ کرنے پر قتل کی سزا ہے۔ چنانچہ کتاب احبار میں ہے: ''اور اگر کوئی مرد اپنی بہن کو جو اس کے باپ کی یا اس کی ماں کی بیٹی ہو، لے کر اس کا بدن دیکھے تو یہ شرم کی بات ہے۔ وہ دونوں اپنی قوم کے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے قتل کئے جائیں۔ اس نے اپنی بہن کو بے پردہ کیا۔ اس کا گناہ اسی کے سر لگے گا''۔ (۱۸/ج)

حضرت یعقوبؑ نے اپنی ماموں زاد دو حقیقی بہنوں راخل اور لیاہ سے نکاح کیا تھا۔ (۱۸/د) لیکن موسوی شریعت میں یہ حکم دیا گیا: ''تو اپنی سالی سے بیاہ کر کے اسے اپنی بیوی کی سوکن نہ بنانا کہ دوسری کے جیتے جی اس کے بدن کو بھی بے پردہ کرے''۔ (۱۹/الف)

حضرت موسیٰؑ کے والد عمرام (عمران) نے اپنی پھوپھی سے نکاح کیا تھا چنانچہ کتاب خروج میں ہے: ''اور عمرام نے اپنے باپ کی بہن یوکبد سے بیاہ کیا۔ اس عورت سے اس کے ہارون اور موسیٰ پیدا ہوئے.....'' (۱۹/ب) ادھر کتاب احبار میں حضرت موسیٰؑ اور ان کی امت کے لئے خدا کا حکم یوں مذکور ہے: ''تو اپنی پھوپھی کے بدن کو بے پردہ نہ کرنا کیونکہ وہ تیرے باپ کی قریبی رشتے دار ہے''۔ (۱۹/ج)

بائبل کے مذکورہ مضامین سے ثابت ہوا کہ لوگوں کے لئے خدا کے بعض احکام حسب موقع و ضرورت بدلتے رہے ہیں۔ اسی کو ہم نسخِ احکام یعنی احکام کا منسوخ ہونا قرار دیتے ہیں۔ اگر نسخ نہ ہو تو حضرت ابراہیمؑ کی حضرت سارہؓ سے چلنے والی نسل کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) صحیح النسب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تمام اسرائیلی انبیاء علیہم السلام اس کی زد میں آئیں گے۔ اور کوئی بھی (معاذ اللہ) خداوندی جماعت میں شامل نہیں ہو سکے گا کیونکہ کتاب استثناء میں ہے: ''کوئی حرام زادہ خداوند کی جماعت میں

داخل نہ ہو۔ دسویں پشت تک اس کی نسل میں سے کوئی خداوند کی جماعت میں آنے نہ پائے''۔ (۲۰/الف)

نسخ کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی حکم سرے سے واپس لے لیا جائے، جیسے نسخ کی مذکورہ بالا مثالوں میں دو بہنوں سے بہ یک وقت نکاح، علاتی بہن سے نکاح، پھوپھی سے نکاح کی اجازت کا موسوی شریعت میں منسوخ ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ نسخ کی دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے حکم کی بہ جائے دوسرا حکم لایا جائے جیسے بہ مطابق کتاب پیدائش حضرت ابراہیمؑ کو خدا نے حکم دیا تھا کہ اپنے بیٹے اضحاق (حضرت اسحاقؑ) کو میرے لئے ذبح کرو لیکن یہ حکم محض حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کے لئے تھا۔ خدا نے اس حکم کو منسوخ کرتے ہوئے فرمایا: ''تو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اس سے کچھ کر۔ میں اب جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے۔ اس لئے کہ تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے، مجھ سے دریغ نہ کیا''۔ (۲۰/ب)

کتاب پیدائش کا یہ مضمون محرّف ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے اکلوتے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ تھے۔ حضرت اسحاقؑ تو حضرت اسماعیلؑ سے چودہ برس چھوٹے تھے۔ تاہم اس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کے ذبح کرنے کا جو حکم دیا تھا، اسے منسوخ کر دیا۔ اب اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی بہ جائے آپ نے خدا کے حکم کے مطابق مینڈھا ذبح کیا۔ چنانچہ اسی کتاب پیدائش میں ہے: ''اور ابراہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابراہام نے جا کر اس مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا''۔ (۲۰/ج)

اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ ضروری نہیں کہ کسی پیغمبر کی شریعت میں صرف سابقہ شرائع کے بعض احکام ہی منسوخ ہوں بلکہ خود اس پیغمبر کی شریعت میں بھی بعض احکام منسوخ کر دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ شریعتِ محمدیہؐ میں بھی بعض احکام کا منسوخ ہو جانا قابلِ اعتراض نہیں لیکن شریعت کے مکمل ہو جانے اور آئندہ کے لئے نبوت کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد نسخ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس قسم کا ناقابل قبول نسخ تو بائبل کے نئے عہدنامے کے مطابق عیسائیوں نے اپنی طرف سے عیسوی شریعت میں کر دیا۔ حضرت یسوعؑ نے اگرچہ موسوی شریعت کو پورا کر دیا تھا اور بعد میں کسی نسخ کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی لیکن پولس نے رسالت کا جھوٹا دعویٰ کر کے حضرت یسوعؑ کی تعلیم کو بدل ڈالا، جس کی وضاحت آئندہ سطور میں مناسب مقام پر ہوگی۔

نسخ کی ایک صورت یہ ہے کہ حکم تو اپنی جگہ پر بحال رہے لیکن اس سے متعلق بعض جزوی مسائل میں کمی بیشی کے ذریعے کچھ ترمیم کر دی جائے۔ مثلاً موسوی شریعت میں جائز تھا کہ کوئی شخص کسی بھی وجہ سے

اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا تھا چنانچہ کتابِ استثناء میں ہے: ''اگر کوئی مرد کسی عورت سے بیاہ کرے اور پیچھے اس میں کوئی ایسی بے ہودہ بات پائے جس سے اس عورت کی طرف اس کی التفات نہ رہے تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کر اس کے حوالے کرے اور اسے اپنے گھر سے نکال دے اور جب وہ اس کے گھر سے نکل جائے تو وہ دوسرے مرد کی ہوسکتی ہے''۔(۲۱/الف)

لیکن حضرت یسوعؑ نے طلاق کی اس اجازت کو عام نہیں رہنے دیا بلکہ صرف اس صورت میں جائز قرار دیا جب عورت حرام کار (زانیہ) ہو۔ چنانچہ انجیل متی میں ہے ''موسیٰ نے تمہاری سخت دلی کے سبب سے تم کو اپنی بیویوں کو چھوڑ دینے کی اجازت دی مگر ابتدا سے ایسا نہ تھا اور میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے، وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرلے وہ بھی زنا کرتا ہے۔'' (۲۱/ب) اس سے معلوم ہوا کہ طلاق کے متعلق حکم میں دو مرتبہ نسخ واقع ہوا۔ موسوی شریعت سے پہلے بیوی کو طلاق دینے کی عام اجازت نہ تھی لیکن لوگوں کی سخت دلی کی وجہ سے موسوی شریعت میں یہ حکم منسوخ ہوگیا اور بیویوں کو طلاق دینے کی عام اجازت ہوگئی لیکن عیسوی شریعت میں پھر اس عام اجازت کو منسوخ کر کے صرف اسی صورت میں طلاق کی اجازت بہ حال رکھی گئی جب کہ عورت حرام کاری کرے۔ اور مثلاً موسوی شریعت کے مشہور دس احکام میں یہ بھی تھا کہ زنا نہ کرنا۔ حضرت یسوعؑ نے اس میں مزید شدت پیدا کرتے ہوئے فرمایا: ''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زنا نہ کرنا۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ جس کسی نے بری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔ پس اگر تیری داہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اسے نکال کر اپنے پاس سے پھینک دے کیونکہ تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضا میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ ڈالا جائے۔ (۲۱/ج) اور مثلاً احکام عشرہ میں یہ بھی شامل تھا کہ جھوٹی قسم نہ کھانا۔ اس میں بھی حضرت یسوعؑ نے مزید شدت پیدا کرتے ہوئے فرمایا: ''پھر تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ جھوٹی قسم نہ کھانا بلکہ اپنی قسمیں خداوند کے لئے پوری کرنا۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ بالکل قسم نہ کھانا.....'' (۲۲/الف)

اور مثلاً احکام عشرہ میں سبت (سنیچر) کے دن کا احترام بھی شامل تھا کہ اس دن ہرگز کوئی کام نہ کیا جائے، اس حکم کی خلاف ورزی کی سزا قتل تھی۔ چنانچہ سبت کے دن جنگل میں لکڑیاں جمع کرنے والے ایک شخص کو حضرت موسیٰؑ کے حکم سے سنگ سار کیا گیا تھا۔ (۲۲/ب) یہودیوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ سبت کے دن کسی طرح کا کام بھی ممنوع ہے لیکن حضرت یسوعؑ نے اپنے عمل سے یہودیوں پر واضح فرمایا کہ سبت کے دن دنیوی کام ممنوع ہیں۔ خدمت خلق کا دینی کام مثلاً کسی دنیوی نفع اور لالچ کے بغیر بیماروں کی

خدمت ممنوع نہیں ہے۔ چنانچہ انجیل متی میں ہے: ''اور دیکھو، وہاں ایک آدمی تھا جس کا ہاتھ سوکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اس (یسوع) پر الزام لگانے کے ارادے سے یہ پوچھا کہ کیا سبت کے دن شفا دینا روا ہے؟ اس نے ان سے کہا کہ تم میں ایسا کون ہے جس کی ایک ہی بھیڑ ہو اور وہ سبت کے دن گڑھے میں گر جائے تو وہ اسے پکڑ کر نہ نکالے۔ پس آدمی کی قدر تو بھیڑ سے بہت زیادہ ہے۔ اس لئے سبت کے دن نیکی کرنا روا ہے''۔ (۲۲/ج) اناجیل کے اس طرح کے بعض مضامین کی قرآن کریم سے بھی تائید ہوتی ہے، مثلاً حضرت عیسیٰؑ (یسوع) نے اپنی بعثت کے مقاصد بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰى وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ

(۲۳/الف)

میں توریت کی تصدیق کرتا ہوں جو میرے سامنے ہے (کہ واقعی یہ حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی) اور میں (اس لئے بھی آیا ہوں کہ) بعض چیزیں جو تم پر (موسوی شریعت میں پیغمبروں کی زبانی یا یہودی علما کے دین میں غلو اور شدت کی وجہ سے) حرام کر دی گئی تھیں، تمہارے لئے حلال قرار دوں۔

تاہم نسخ کی اس صورت کو حضرت یسوعؑ نے بہ مطابق اناجیل ''نسخ'' کا عنوان نہیں دیا بلکہ اسے ''تکمیلِ دین'' قرار دیا۔ انجیل متی میں حضرت یسوعؑ کا ارشاد ہے: ''یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے''۔ (۲۳/ب)

حضرت یسوعؑ کے اس قول سے معلوم ہو رہا ہے کہ تورات کے احکام ہرگز منسوخ نہ ہوں گے اور جن بعض احکام کے متعلقہ مسائل میں کچھ کمی بیشی کی گئی ہے اور جس کی کچھ مثالیں اوپر مذکور ہو چکی ہیں، ان سے موسوی شریعت کی منسوخی نہیں بلکہ اس کی تکمیل مقصود ہے۔ اسے حضرت یسوعؑ نے موسوی شریعت کو پورا اور مکمل کرنے کا عنوان اس لئے دیا ہے کہ آپ آخری اسرائیلی پیغمبر ہیں۔ موسوی شریعت کے بعض احکام کے متعلقہ مسائل میں جو کمی بیشی کی گئی ہے، وہ اب موسوی شریعت میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی معنی میں عیسوی شریعت دراصل موسوی شریعت کو پورا کرنے والی شریعت یا نیا عہد کہلائی۔ جس کی طرف کتابِ یرمیاہ میں یوں اشارہ کیا گیا ہے: ''دیکھو وہ دن آتے ہیں خداوند فرماتا ہے جب میں اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا''۔ (۲۳/ج) اسی معنی میں

قرآن کریم میں بھی شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو تکمیل دین کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں۔ آپ کے بعد چونکہ قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا، لہٰذا آپ کے بعد آپ کی لائی ہوئی شریعت کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوگا۔ گو بعض حالات میں اس پر عمل موقوف اور معطل ہو۔ سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور اسلام کو تمہارے لئے بطور دین پسند کر لیا''۔ (۲۴/الف)

الغرض حضرت یسوعؑ نے انجیل متی میں مذکور اپنے قول کے مطابق تورات اور ملحقہ کتب کو منسوخ نہیں کیا بلکہ موسوی شریعت کی تکمیل کی ہے۔ چنانچہ اسی انجیل متی میں یہ بات سمجھاتے ہوئے حضرت یسوعؑ کا قول یوں مذکور ہے: ''پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا اور یہی آدمیوں کو سکھائے گا، وہ آسمان کی بادشاہی میں چھوٹا کہلائے گا۔ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری راست بازی (یہودی) فقیہوں اور فریسیوں کی راست بازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہی میں ہرگز داخل نہ ہوگے''۔ (۲۴/ب)

حضرت یسوعؑ کے مذکورہ ارشادات کے ایک مدت بعد ایک مرتبہ ایک شخص دوڑتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے پوچھنے لگا: ''اے نیک استاد، میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں؟ یسوع نے اس سے کہا تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔ تو حکموں کو تو جانتا ہے خون نہ کر، زنا نہ کر، چوری نہ کر، جھوٹی گواہی نہ دے، فریب دے کر نقصان نہ کر، اپنے باپ کی اور ماں کی عزت کر''۔ (۲۴/ج) اسی سے ملتا جلتا مضمون انجیل متی اور انجیل لوقا کا بھی ہے۔ (۲۵/الف) اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت یسوعؑ نے موسوی شریعت کے احکام عشرہ کو بہ حال رکھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں ختنے کا جو دائمی حکم تھا، وہ موسوی شریعت میں بھی برقرار رہا اور عیسوی شریعت میں بھی اسے بہ حال رکھا گیا۔ چنانچہ خود حضرت یسوعؑ کا ختنہ بھی ان کی ولادت کے بعد آٹھویں دن ہوا تھا۔ (۲۵/ب) بہ مطابق انجیل متی حضرت یسوعؑ کی (مبینہ) مصلوبیت سے پہلے یہودیوں کی عید الفطر (عید الفسح) تھی جسے یہودی نیساں کے مہینے میں مناتے ہیں۔ آپ کے شاگردوں نے آپ سے پوچھا کہ ''تو کہاں چاہتا ہے کہ ہم تیرے لئے فسح (عید کے دنبے کا گوشت) کھانے کی تیاری کریں؟ اس نے کہا شہر میں فلاں شخص کے پاس جا کر اس سے کہنا استاد فرماتا ہے کہ میرا وقت نزدیک ہے۔ میں اپنے شاگردوں کے ساتھ تیرے ہاں عید فسح کروں گا''۔ (۲۵/ج)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت یسوعؑ بچپن سے لے کر اپنی زندگی کے آخری ایام تک ہمیشہ

موسوی شریعت اور اس کی مروجہ مذہبی رسوم پر پوری طرح عمل پیرا رہے۔ حضرت یسوعؑ بھی حضرت موسیٰؑ کی طرح بنی اسرائیل کے لئے بھیجے گئے تھے لیکن علاقے میں موجود غیر اسرائیلیوں کو بھی ضمناً دین کی دعوت دینے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو حق قبول کرنے کی دعوت دی تھی، حالانکہ ان کا تعلق بنی اسرائیل سے نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت یسوعؑ کے رفع سماوی کے بعد جب حواریوں نے اسرائیلیوں کے علاوہ ان علاقوں میں موجود غیر اسرائیلیوں (Gentiles) کو بھی حضرت یسوعؑ پر ایمان لانے کی دعوت دی تو ایک بڑا مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ختنے وغیرہ کے موسوی شریعت کے احکام کا غیر اسرائیلیوں کو پابند کیا جائے یا انہیں فی الحال ان احکام سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ حواریوں کی یروشلم کونسل میں یہ فیصلہ ہوا کہ غیر اسرائیلیوں پر یک دم بوجھ نہ ڈالا جائے۔ چنانچہ غیر اسرائیلیوں کو یہ پیغام دیا گیا..... ''کیونکہ روح القدس اور ہم نے مناسب جانا کہ ان ضروری باتوں کے سوا تم پر اور بوجھ نہ ڈالیں کہ تم بتوں کی قربانیوں کے گوشت سے اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ اگر تم ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھو گے تو سلامت رہو گے۔ والسلام'' (۲۶ر الف)

حواریوں کے اس فیصلے سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ حضرت یسوعؑ نے اپنی دنیوی زندگی میں موسوی شریعت کے احکام کو ہرگز ہرگز منسوخ نہیں فرمایا تھا ورنہ حواریوں میں اختلاف پیدا ہونے اور بحث وتمحیص کے بعد مذکورہ فیصلے پر پہنچنے کی قطعاً کوئی وجہ ہی نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ لوگوں کے لئے حواریوں کے دعائیہ کلمات یہ تھے کہ تم پر سلام ہو۔ جیسا کہ کتاب اعمال کی مذکورہ عبارت کے آخر میں ''والسلام'' کے لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ وہ صبح بہ خیر یا شب بخیر وغیرہ نہیں کہا کرتے تھے۔ تیسرے یہ کہ موسوی شریعت کے تمام احکام پر حواری خود تو عمل پیرا تھے مگر جو احکام غیر اسرائیلیوں کے لئے غیر مانوس اور ان پر بھاری تھے، ان کے متعلق حواریوں نے مناسب نہ سمجھا کہ ان کا یکدم بوجھ ان پر ڈالا جائے اور ایمان کو ان اعمال کے ساتھ مشروط کر کے انہیں پریشان کیا جائے جس سے وہ دولتِ ایمان ہی سے سرے سے محروم رہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرنے کے لئے یہ شرط لگائے کہ وہ ختنہ نہیں کرائے گا وہ جوا اور شراب نوشی وغیرہ نہیں چھوڑے گا تو اسے یہی کہا جائے گا کہ تم بہر حال اسلام قبول کرو۔ کیونکہ شراب نوشی وغیرہ گناہ کے کام تو ہیں لیکن یہ کفر کی حد تک نہیں پہنچتے، کفر تو ان سب سے سنگین تر ہے۔ لہٰذا یہاں اھون البلیتین یعنی دو خرابیوں میں سے چھوٹی خرابی (Minor Evil) کو گوارا کر لیا جائے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام میں شراب نوشی وغیرہ کی ممانعت باقی نہیں رہی۔ حواریوں کا مقصد بھی یہی تھا جیسا کہ ان کے یہ کلمات ''ان ضروری باتوں کے سوا تم پر اور بوجھ نہ ڈالیں۔'' ہمارے اس دعوے کی بہ خوبی تائید کر رہے

ہیں۔لیکن پولس جو حضرت یسوعؑ کی زندگی میں آپ کا اور آپ کے حواریوں کا باعترافِ خود بدترین دشمن رہا تھا اور جو آپ کے عروجِ آسمانی کے بعد بھی ایک مدت تک اسی روش پر قائم رہا، وہ اچانک تین سال تک منظر سے غائب ہو گیا اور بعد میں یہ دعویٰ کر دیا کہ دمشق کو جاتے ہوئے مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر زبردست روشنی ہوئی اور اس روشنی میں سے حضرت یسوعؑ نے مجھے کہا کہ تو کب تک مجھے ستاتا رہے گا؟ اس پر میں ایمان لے آیا اور مجھے حضرت یسوعؑ نے اپنا رسول بنایا ہے، وغیرہ سب باتیں ہم ''پولس اور بائبل'' کے عنوان کے تحت قدرے تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔(۲۶/ب) یہی وہ شخص ہے جس نے حضرت یسوعؑ کی تعلیم میں تحریف کی اور جن صحیح عقائد و اعمال کی آپ نے اپنے حواریوں کو تعلیم دی تھی، یسوعؑ کے اس خود ساختہ رسول پولس نے انہیں بری طرح بگاڑ دیا۔حضرت یسوعؑ اور ان کے حواری زندگی بھر موسوی شریعت کے احکام پر عمل پیرا رہے اور جیسا کہ قبل ازیں مذکور ہو چکا ہے، موسوی شریعت کے احکام میں بعض جزوی تبدیلیوں کو حضرت یسوعؑ نے نسخ کا نہیں بلکہ تکمیل دین کا نام دیا تھا لیکن پولس نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے یروشلم کونسل میں حواریوں کے مذکورہ بالا فیصلے کو غلط رنگ دیتے ہوئے اور حواریوں کی بھرپور مخالفت اور ان سے عناد و عداوت کا رویہ اپناتے ہوئے تورات کے تمام احکام کو منسوخ قرار دے ڈالا اور اس مقصد کے لئے اس نے نسخ کا ایسا مکروہ تصور پیش کیا کہ عقل سلیم رکھنے والا کوئی بھی شخص اسے ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا۔نسخ کی یہ (مفروضہ اور جھوٹی) صورت یہ ہے کہ خدا کا پہلا حکم (معاذ اللہ) ناقص ثابت ہو، اس لئے خدا کو وہ حکم واپس لینا پڑے اور اس کی جگہ نیا حکم لانا پڑے۔خدا کے لئے نسخ کی یہ صورت تجویز کرنا خدا کی سخت توہین اور کفر ہے۔قرآن کریم سے نسخ کی یہ (مفروضہ) صورت ہرگز ہرگز ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہی مسلمان اس کفر کے کبھی قائل ہو سکتے ہیں۔البتہ پولس نے نسخ کی اسی صورت کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے۔چنانچہ وہ تورات کو (معاذ اللہ) ناقص قرار دیتا ہے۔عبرانیوں کے نام خط میں وہ لکھتا ہے: ''کیونکہ اگر پہلا عہد بے نقص ہوتا تو دوسرے کے لئے موقع نہ ڈھونڈا جاتا''۔(۲۶/ج) اور اسی پولس نے موسوی شریعت کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) لعنت قرار دیا ہے۔وہ لکھتا ہے: ''مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا، اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا.....''(۲۷/الف)

ایسے خبیث مضامین کے متعلق اس کا (جھوٹا) دعویٰ ہے کہ یہ سب کچھ حضرت یسوعؑ نے بہ ذریعہ مکاشفہ مجھے سکھایا ہے۔(۲۷/ب) پولس نے حضرت یسوعؑ کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) جو لعنتی قرار دیا ہے، اس کا اشارہ کتابِ استثناء کے اس مضمون کی طرف ہے کہ: ''اگر کوئی شخص ایسا کام کرے جس سے اس کا قتل واجب ہو گیا ہو اور اس جرم میں اسے مار کر درخت پر لٹکا دیا جائے تو اس کی لاش رات بھر درخت پر لٹکی

نہ رہے کیونکہ جسے پھانسی ملتی ہے وہ ملعون ہوتا ہے''۔(۲۷/ج)

ہمارے مسیحی بھائی خوفِ خدا کو دل میں جگہ دیتے ہوئے بتائیں کہ حضرت یسوعؑ نے کون سا ایسا گناہ کیا تھا جس سے ان کا قتل واجب ہو گیا تھا۔ اگر وہ گناہ گار تھے خواہ یہ گناہ انہوں نے خود کئے ہوں یا (عیسائیوں کے بہ قول) نوعِ انسانی کے گناہ اپنے اوپر لاد کر وہ (معاذ اللہ) گناہ گار ہو گئے ہوں تو دونوں صورتوں میں انہیں معصوم عن الخطاء قرار دینا کیسے درست ہوگا؟ اگر وہ بے قصور تھے تو کتابِ استثناء کے مضمون کے مطابق ملعون تو وہ ہوگا جس نے ایسا گناہ کیا ہو۔ جس سے اس کا قتل واجب ہو چکا ہو۔ ادھر ہمارے یہی مسیحی بھائی اسی پولس کی (جھوٹی) تعلیم کے زیرِ اثر حضرت یسوعؑ کو خدا بھی قرار دیتے ہیں اور کتابِ احبار میں ہے کہ: جو کوئی خدا کو ملعون کہے یا اسی طرح کا کوئی اور کفر بکے تو اسے سنگ سار کیا جائے بلکہ اگر کوئی شخص اپنے ماں باپ پر لعنت کرے تو اس کے لئے بھی سنگ ساری کی سزا ہے۔(۲۸/الف)

پولس اور اس کے زیرِ اثر عیسائیوں نے ذرا بھی خیال نہ کیا کہ حضرت یسوعؑ کو اور موسوی شریعت کو (معاذ اللہ) ملعون قرار دینے سے وہ سب کے سب سنگ سار کئے جانے کے لائق ہیں۔ چہ جائے کہ ان لغو عقائد کی بنا پر وہ نجات کی اور جنت میں داخلے کی امید رکھیں۔ جب بہ موجب تورات ماں باپ کو لعنتی قرار دینے والا بھی سنگ سار کئے جانے کے لائق ہے تو کیا حضرت یسوعؑ عیسائیوں کے ہاں ان کے ماں باپ سے بھی (معاذ اللہ) گئے گزرے ہیں کہ پولس اور اس کے زیرِ اثر عیسائیوں نے بے دھڑک انہیں لعنتی قرار دے ڈالا۔ الغرض پولس کے نظریۂ نسخ کا فلسفہ تو معلوم ہو چکا کہ خدا کے پہلے احکام (معاذ اللہ) ناقص تھے۔ اس لئے بہ قول اس کے وہ سب کالعدم اور منسوخ ہیں۔ اسی فاسد نظریئے کے تحت اس نے عملاً خنزیر کے گوشت کو حلال قرار دے کر عیسائیوں کے حلق میں اتار دیا۔ حالانکہ یہ موسوی شریعت میں قطعاً حرام تھا۔(۲۸/ب) حلت وحرمت کے خود ساختہ اصول کے تحت پولس طیطس کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے:

> پاک لوگوں کے لئے سب چیزیں پاک ہیں مگر گناہ آلود اور بے ایمان لوگوں کے لئے کچھ بھی پاک نہیں بلکہ ان کی عقل اور دل دونوں گناہ آلود ہیں۔(۲۸/ج)

ہمارے مسیحی بھائی خدا سے ڈرتے ہوئے ہمیں بتائیں کہ حضرت یسوعؑ سمیت تمام اسرائیلی انبیاء علیہم السلام نے موسوی شریعت کے حرام جانوروں مثلاً خنزیر وغیرہ کا گوشت کبھی کھایا تھا؟ کیا ''گناہ آلود اور بے ایمان'' کی پولس کی مذکورہ گالی حضرت یسوعؑ سمیت تمام اسرائیلی نبیوں پر چسپاں نہیں ہوتی؟ پولس کے حلال وحرام کے مذکورہ فلسفے کے تحت جب حضرت یسوعؑ اور تمام اسرائیلی انبیاء (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) گناہ آلود اور بے ایمان ٹھہرتے ہیں تو وہ لازماً (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) حرام خور بھی ٹھہریں گے کیونکہ

بہ قول پولس گناہ آلود اور بے ایمان لوگوں کے لئے کچھ بھی پاک نہیں بالفاظ دیگر ان کے لئے حلال جانور بھی (معاذ اللہ) حرام ہو گئے۔ دیکھئے پولس نے حضرت یسوع کو (معاذ اللہ) ملعون کہنا ہی کافی نہ سمجھا بلکہ وہ آپ کو اور سب ہی دوسرے اسرائیلی انبیاء کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) بے ایمان، گناہ آلود اور حرام خور بھی ٹھہرا رہا ہے۔ یہی پولس اپنے حلال وحرام کے خود ساختہ فلسفے کی وضاحت کرتا ہوا رومیوں کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے: ''مجھے معلوم ہے، بلکہ خداوند یسوع میں مجھے یقین ہے کہ کوئی چیز بذاتہٖ حرام نہیں لیکن جو اسے حرام سمجھتا ہے اس کے لئے حرام ہے''۔ (۲۹/الف)

اور تیمقیس کے نام اپنے پہلے خط میں وہ اس کی مزید وضاحت یوں کرتا ہے: ''کیونکہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز اچھی ہے اور کوئی چیز انکار کے لائق نہیں بہ شرطیکہ شکر گزاری کے ساتھ کھائی جائے، اس لئے کہ خدا کے کلام اور دعا سے پاک ہو جاتی ہے۔ اگر تو بھائیوں کو یہ باتیں یاد دلائے گا تو مسیح یسوع کا اچھا خادم ٹھہرے گا''۔ (۲۹/ب)

ہمارے مسیحی بھائی بتائیں کہ موسوی شریعت میں خنزیر کے علاوہ اونٹ بھی تو حرام تھا۔ (۲۹/ج) کیا وہ خدا کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے؟ وہ شکر گزاری کے ساتھ کیوں نہیں کھایا جا سکتا؟ خدا کے کلام اور دعا سے وہ کیوں پاک نہیں ہو جاتا؟ عیسائی اس کا گوشت کیوں نہیں کھاتے؟ موسوی شریعت میں خرگوش، سافان، عقاب، چیل، باز، گدھ، کوا، الو اور چمگادڑ جیسے جانور اور پرندے بھی حرام تھے۔ (۳۰/الف) کیا وجہ ہے کہ پولس کے حلال وحرام کے مذکورہ فلسفے کے تحت عیسائی حضرات گدھ اور چمگادڑ وغیرہ کا گوشت نہیں کھاتے؟ بلکہ اس فلسفے کے تحت کتا، گیدڑ، بھیڑیا، ریچھ، بندر، نیولا اور چوہا وغیرہ سب ہی کچھ عیسائیوں کو شکر گزاری کے ساتھ کھانا چاہئے۔ کیا یہ خدا کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہیں؟ جب بہ قول پولس خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز اچھی ہے اور کوئی چیز بھی انکار کے لائق نہیں بہ شرطیکہ شکر گزاری کے ساتھ کھائی جائے اور جب بہ قول پولس پاک لوگوں کے لئے سب چیزیں پاک ہیں اور گناہ آلود اور بے ایمان لوگوں کے لئے کچھ بھی پاک نہیں تو ہمارے عیسائی بھائی مذکورہ جانوروں اور پرندوں کا گوشت نہ کھا کر پولس کے فتوے کی روشنی میں کیوں خواہ مخواہ گناہ آلود، بے ایمان اور ناشکرے لوگوں میں اپنے آپ کو شامل کر رہے ہیں؟ کیا اس سے ثابت نہیں ہو جاتا کہ حلال وحرام کے سلسلے میں پولس اور اس کے زیر اثر عیسائیوں کے خیالات ہرگز کسی وحی پر مبنی نہیں، جیسا کہ پولس کا دعویٰ ہے بلکہ یہ سراسر اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کے سوا کچھ نہیں۔ قوانین فطرت کے تحت خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز میں حکمت ہے۔ خواہ ہمیں اس حکمت کا علم ہو یا نہ ہو لیکن قوانین شریعت کے تحت کچھ کام اور کچھ چیزیں پاکیزہ اور اچھی ہیں تو کچھ کام اور کچھ چیزیں خبیث اور

گندی ہیں۔ ورنہ پولسی فلسفے کے تحت ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے اور خدا کی پیدا کی ہوئی کوئی چیز بری نہیں اور خدا کے کلام اور دعا سے بہ قول پولس ہر چیز حلال اور پاک ہو جاتی ہے لہٰذا عیسائیوں کے لئے خدا کے کلام اور دعا کی برکت سے ان خواتین سے نکاح پاک اور حلال ہو جانا چاہئے۔ صرف اس کے لئے حرام ہونا چاہئے جو اسے حرام سمجھے اور بہ قول پولس جس کی عقل اور دل دونوں گناہ آلود ہوں۔ یہاں پولس قوانین فطرت کی آڑ میں خود بھی شیطانی فریب کا شکار ہے اور دوسروں کو بھی فریب دے کر حرام کو حلال ٹھہرا رہا ہے۔ فاعتبروا یاأولی الابصار!

الغرض پولس نے تورات کو ناقص اور موسوی شریعت کو لعنت قرار دے کر کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کے برعکس شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اگرچہ سابقہ شریعتوں کے کئی احکام منسوخ ہیں لیکن قرآن کریم کی تعلیم ہرگز یہ نہیں ہے کہ تورات اور دیگر آسمانی کتابیں (معاذ اللہ) ناقص اور لوگوں کے لئے لعنت تھیں۔ سورۂ مائدہ میں ہے کہ بے شک ہم نے تورات اتاری جس میں (اہل کتاب کی تحریف سے پہلے) ہدایت اور روشنی تھی۔ اسی کے مطابق انبیاء جو (اللہ کے) مسلم یعنی فرماں بردار تھے، یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں اور مشائخ اور اہل علم بھی، کیونکہ وہ اللہ کی (اس) کتاب کے نگہبان مقرر کئے گئے تھے اور اس (کے سچے ہونے) پر گواہ تھے۔ (۳۰/ب) اور مثلاً سورۂ قصص میں ہے کہ: جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آ پہنچا تو کہنے لگے کہ جیسی (نشانیاں) موسیٰ کو ملی تھیں، ویسی اس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیوں نہیں ملیں؟ کیا جو (نشانیاں) پہلے موسیٰ کو دی گئی تھیں ان لوگوں نے ان سے کفر نہیں کیا؟ انہوں نے کہا کہ دونوں (موسیٰ اور محمد ﷺ) جادوگر ہیں۔ ایک دوسرے کے موافق، اور بولے کہ ہم سب سے منکر ہیں۔ (اے پیغمبر) تو کہہ دے کہ اگر تم سچے ہو تو تم اللہ کی طرف سے کوئی اور کتاب لے آؤ جو ان دونوں (کتابوں تورات اور قرآن) سے بڑھ کر ہدایت کرنے والی ہو تا کہ میں بھی اس کی پیروی کروں۔ (۳۰/ج)

اور مثلاً سورۂ انعام میں ہے کہ: ان لوگوں (مشرکین عرب اور قرآن دشمنی میں نزولِ وحی سے انکار کرنے والے بعض متعصب اور معاند یہودیوں) نے اللہ کی جیسی قدر کرنی چاہئے تھی ویسی قدر نہ کی جب انہوں نے یہ کہا کہ اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز (کبھی) نازل نہیں کی، تو کہہ کہ وہ کتاب کس نے اتاری تھی جس کو موسیٰ لایا تھا جو نور اور لوگوں کے لئے ہدایت (کا سرچشمہ) تھی۔ جسے تم (یہودیوں) نے ان متفرق اوراق میں رکھ چھوڑا ہے جن کو تم ظاہر کرتے ہو اور (ساتھ ہی) بہت سی باتوں کو چھپاتے بھی ہو اور تم کو بہت سی ایسی باتیں بتائی گئی تھیں جن کو (پہلے) نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا (کو ان کی خبر تھی) تو کہہ دے کہ (اس تورات کو) اللہ نے (ہی اتارا تھا) پھر تو انہیں ان کی بے ہودگیوں میں کھیلتا چھوڑ

دے۔اور یہ کتاب (قرآن کریم) ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے جو بڑی برکت والی (کتاب) ہے اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے (کہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے سچی ہیں۔گو بعد میں اہل کتاب نے ان میں تحریف کر ڈالی) اور تا کہ تو مکہ والوں کو اور اس کے اردگرد والوں کو (انکار اور نافرمانی کی صورت میں اللہ کے عذاب سے) ڈرائے اور جو لوگ آخرت پر (صحیح معنوں میں) یقین رکھتے ہیں وہ اس (قرآن) پر ایمان لے آتے ہیں اور وہ اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں۔(۱۳/الف)

اس کے بعد اسی سورت میں ان لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جو نبوت کے جھوٹے مدعی ہیں اور جو اللہ کی سچی کتابوں کا انکار کرتے اور مذاق اڑاتے ہیں۔چنانچہ ارشاد ہے کہ اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔حالانکہ اس کے پاس کسی بات کی بھی وحی نہیں آئی اور جو شخص یوں کہے کہ جیسا کلام اللہ نے نازل کیا ہے، اسی طرح کا میں بھی لاتا ہوں اور اگر تو اس وقت انہیں دیکھے جب کہ یہ ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ آگے بڑھا رہے ہوں گے کہ نکالو اپنی جانیں، آج تمہیں ذلت کی سزا دی جائے گی۔اس لئے کہ تم اللہ کے ذمے جھوٹی باتیں لگاتے تھے اور تم اللہ کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے۔(۳۱/ب)

غور کیجئے کہ عیسائیوں کے پولس نے بھی یہی کچھ کیا ہے۔وہ تورات کو (معاذ اللہ) لعنت قرار دیتا ہے اور جھوٹ بولتا ہوا خود کو حضرت یسوعؑ کا رسول قرار دیتا ہے۔وہ یہ جھوٹ اپنے قول کے مطابق خدا اور یسوعؑ کی خاطر بول رہا ہے چنانچہ رومیوں کے نام خط میں وہ لکھتا ہے: ''اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گناہ گار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے''؟(۳۱/ج)

نسخ کی ایک (مجوزہ جھوٹی) صورت یہ ہے کہ خدا کو (معاذ اللہ) مستقبل کا علم نہ ہو اور اسے بعد میں پتہ چلے کہ جن لوگوں کے لئے اس نے حکم جاری کیا تھا وہ اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔لہٰذا وہ حکم واپس لینا پڑے۔نسخ کی یہ صورت تجویز کرنا بھی خدا کی سخت توہین اور کفر ہے۔تحریف کی وجہ سے بائبل میں اس توہین آمیز کفریہ نسخ کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔جب کہ قرآن کریم ان خرافات سے قطعاً پاک اور منزہ ہے۔

بہ مطابق کتاب سموئیل اول خدا نے سموئیل نبی کی درخواست پر بنی اسرائیل کے لئے ساؤل (طالوت) کو بادشاہ مقرر کیا تھا۔مگر بہ مطابق بائبل، بعد میں جب خدا نے ساؤل کے برے کرتوت دیکھے تو سموئیلؑ سے (معاذ اللہ) یوں معذرت کی: ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے ساؤل کو بادشاہ ہونے کے لئے مقرر کیا کیونکہ وہ میری پیروی سے پھر گیا ہے اور اس نے میرے حکم نہیں مانے''۔(۳۲/الف) اور اسی کتاب سموئیل اول میں ہے: ''سموئیل ساؤل کے لئے غم کھاتا رہا اور خداوند ساؤل کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کرکے ملول

ہوا''۔(۳۲/ب) بالآخر خدا نے ساؤل سے بادشاہت چھین لی اور اس کی جگہ حضرت داؤدؑ کو بنی اسرائیل کا بادشاہ بنایا۔ چنانچہ اسی کتاب سموئیل اول میں ہے: ''اور خداوند نے سموئیل سے کہا تو کب تک ساؤل کے لئے غم کھاتا رہے گا جس حال کہ میں نے اسے بنی اسرائیل کا بادشاہ ہونے سے رد کر دیا ہے''۔(۳۲/ج)

اس کے بعد اسی کتاب میں ہے: ''تب سموئیل نے تیل کا سینگ لیا اور اسے (یعنی داؤد کو) اس کے بھائیوں کے درمیان مسح کیا اور خداوند کی روح اس دن سے آگے کو داؤد پر زور سے نازل ہوتی رہی.....'' (۳۳/الف) یعنی حضرت داؤدؑ صرف بادشاہ ہی نہیں بلکہ خدا کے نبی بھی ہوئے۔ دیکھئے خدا نے بہ مطابق بائبل سموئیل نبی کی درخواست پر ساؤل کو بادشاہ مقرر کیا پھر اس کے ناپسندیدہ کاموں پر خدا کو (معاذ اللہ) بہت پچھتانا پڑا اور اس نے اپنا پہلا فیصلہ سموئیل نبی ہی کے ذریعے منسوخ کرتے ہوئے حضرت داؤدؑ کو نیا بادشاہ مقرر کیا۔ قرآن کریم نے نسخِ احکام کا جو تصور دیا ہے وہ ہرگز قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ جو حکم منسوخ ہوتا ہے وہ منسوخی سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق ایک خاص مدت اور حالت کے لئے ہوتا ہے۔ اس مدت کے پورا ہونے اور حالت کے بدل جانے پر اس حکم کو واپس لے لیا جاتا ہے یا اس کی جگہ نیا حکم لایا جاتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی ماہر طبیب کسی مریض کے مرض اور اس کی حالت کے مطابق دوا اور غذا کا ایک نسخہ تجویز کرتا ہے۔ جب مریض کی حالت بدل جاتی ہے تو وہ دوسرا نسخہ تجویز کرتا ہے اس لئے نہیں کہ پہلا نسخہ ناقص تھا بلکہ اس لئے کہ مریض کی حالت بدل جانے سے پہلا نسخہ اس کی نئی حالت کے مطابق نہیں رہا تھا اور مریض کی موجودہ حالت اس کے لئے دوسرے نسخے کا تقاضا کر رہی تھی۔ اس طرح کا نسخ بائبل سے بھی بہ خوبی ثابت ہے۔ جیسا کہ ہم اس مضمون کی ابتدا ہی میں واضح کر چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت کے متعدد احکام حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں منسوخ ہو گئے بلکہ پیغمبر کی زندگی میں اس پر چونکہ وحی کے نزول کا امکان ہر وقت ہوتا ہے اس لئے خود اسی پیغمبر کی شریعت کے بعض سابقہ احکام کی جگہ نئے احکام لائے جا سکتے ہیں۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا جو حکم ملا تھا وہ منسوخ کر دیا گیا اور اس کی جگہ مینڈھا ذبح کرنے کا نیا حکم انہیں دیا گیا۔ اس طرح کے نسخ کے متعلق قرآن کریم میں مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے کہ: ہم جس آیت کو منسوخ کرتے یا اسے (ذہن) سے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت لے آتے ہیں۔ کیا تو جانتا نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے؟ کیا تو جانتا نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے؟ اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔ (۳۳/ب) اور سورۂ حج میں ہے کہ: ہم نے ہر ایک امت کے لئے ایک شریعت مقرر کر دی ہے جس پر وہ چلتے ہیں تو یہ لوگ تجھ سے اس بارے میں جھگڑا نہ کریں اور تو (لوگوں کو) اپنے رب کی طرف بلاتا رہ۔ بے

شک تو سیدھے راستے پر ہے اور اگر یہ تجھ سے جھگڑا کریں تو تو کہہ دے کہ جو عمل تم کرتے ہو اللہ ان سے خوب واقف ہے۔ (۳۳/ج)

اور مثلاً سورۂ مائدہ میں ہے کہ: (اے پیغمبر) ہم نے تجھ پر سچی کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر نگہبان ہے تو جو اللہ نے (تجھ پر) نازل کیا ہے تو اسی کے مطابق ان (اہل کتاب) کے درمیان فیصلہ کر اور اسے چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک (امت) کے لئے ایک شریعت اور دستور مقرر کیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت (یعنی ایک ہی شریعت پر) کر دیتا۔ لیکن جو احکام اس نے دیئے ہیں ان میں وہ تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے (تاکہ سب پر ظاہر ہو جائے کہ کون ان پر ایمان رکھتا اور ان پر عمل کرتا ہے اور کون ان کا انکار کرتا اور لغو اعتراضات کرتا ہے) سو تم نیک کاموں میں سبقت کرو۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا لوٹ کر جانا ہے۔ پھر وہ تمہیں سب باتیں بتا دے گا جن میں تم اختلاف کرتے ہو۔ (۳۴/الف)

اور مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے کہ: بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو اس قبلے (بیت المقدس) سے کس چیز نے پھیر دیا جس پر وہ پہلے قائم تھے (اور اب انہوں نے نیا قبلہ خانہ کعبہ اختیار کر لیا ہے) تو کہہ دے کہ مشرق و مغرب اللہ ہی کا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر چلا دیتا ہے۔ (۳۴/ب) مذکورہ بالا مباحث سے معلوم ہوا کہ نسخ کی وہ صورتیں جن سے اللہ تعالیٰ کی توہین لازم نہیں آتی اور جن پر عقلاً کوئی اعتراض یا اشکال وارد نہیں ہوتا، بائبل اور قرآن دونوں سے بہ خوبی ثابت ہیں، اور نسخ کی ایسی صورتیں تجویز کرنا اللہ کی سخت توہین اور کفر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) مستقبل کا علم نہیں ہوتا۔ اس لئے اپنے پہلے حکم اور فیصلے پر اسے (معاذ اللہ) پچھتاتے ہوئے حکم منسوخ اور تبدیل کرنا پڑتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے سابقہ احکام (معاذ اللہ) ناقص اور لوگوں کے لئے لعنت ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں منسوخ کرنے اور نئے احکام لانے کی اسے ضرورت پیش آتی ہے۔ نسخ کا ایسا خبیث تصور (محرف) بائبل میں یقیناً موجود ہے جس کی ہم کماحقہ وضاحت قبل ازیں سطور بالا میں کر چکے ہیں۔ قرآن کریم ایسے بے ہودہ تصورات اور خیالات سے پاک ہے لیکن شرم و حیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے متعصب اہل کتاب قرآن کریم میں مذکور نسخ احکام پر وہی اعتراضات کرتے ہیں جو دراصل قرآن کریم پر ہرگز ہرگز نہیں بلکہ محرّف بائبل کے پرانے اور نئے عہد نامے کی کتب پر ٹھیک ٹھیک وارد ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ہم نے ان متعصب اہل کتاب کو ان کا چہرہ ان کے اپنے ہی آئینے میں اچھی طرح دکھا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جہالت، تعصب اور ناحق ضد کے مہلک اثرات سے محفوظ رکھے۔

موسوی شریعت کے بعض احکام مثلاً سبت (سنیچر) کے دن کے احترام کے متعلق بائبل کے پرانے عہد نامے کی کتب مثلاً کتاب خروج میں اس طرح کے احکام ملتے ہیں: ''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو بنی اسرائیل سے یہ بھی کہہ دینا کہ تم میرے سبتوں کو ضرور ماننا، اس لئے کہ یہ میرے اور تمہارے درمیان تمہاری پشت در پشت ایک نشان رہے گا.....'' (۳۴/ج)

یہاں بہ ظاہر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ سبت کے احترام کا یہ حکم دائمی تھا تو شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں یہ کیوں منسوخ ہو گیا؟ غور کیجئے یہ اعتراض ہم مسلمانوں پر قطعاً وارد نہیں ہوتا کیونکہ ہم بائبل کو محرف سمجھتے ہیں۔ نیز موسوی شریعت کے اصل مکلّف اور پابند بنی اسرائیل تھے یعنی موسوی شریعت اسرائیلی شریعت تھی تو جب تک موسوی شریعت قائم رہی، اس طرح کے اس کے دور میں احکام بھی برقرار رہے۔ اور حضرت یسوعؑ کے متعلق قبل ازیں انجیل متی کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے کہ عیسوی شریعت میں موسوی شریعت کو منسوخ نہیں کیا گیا بلکہ اس کے احکام کے بعض جزوی مسائل میں کچھ ترمیم کر کے موسوی شریعت کو پورا کیا گیا تھا کیونکہ حضرت یسوعؑ آخری اسرائیلی پیغمبر تھے یعنی عیسوی شریعت دراصل موسوی شریعت ہی کا تکملہ تھی، جو بنی اسرائیل کے لئے اس وقت تک ناقابل تغیر اور ناقابل تنسیخ رہی جب تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کی دوسری شاخ بنی اسماعیل میں پیدا ہونے والے سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عالمی اور آفاقی شریعت نے اس کی جگہ نہیں لے لی۔ پولس نے عیسوی شریعت میں جو کچھ کیا وہ دراصل تحریف ہے جسے ناحق تنسیخ کا نام دیا گیا، لہٰذا عیسائیوں پر ہی یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ جب ان کے نزدیک بائبل کا پرانا عہد نامہ موجودہ صورت میں الہامی اور مقدس ہے اور موسوی شریعت کے ان دائمی احکام کو بھی وہ مقدس اور الہامی کہتے ہیں اور پوری بائبل کو ''کتاب مقدس یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ'' کا عنوان دیتے ہیں اور جب کہ بہ مطابق اناجیل حضرت یسوعؑ نے کبھی بھی ان احکام کی منسوخی کا اعلان نہیں فرمایا بلکہ علی الاعلان یہ بتایا کہ میں تورات اور نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں اور جب کہ حضرت یسوعؑ عمر بھر موسوی شریعت کی رسوم پر عمل پیرا رہے مثلاً بچپن میں آپ کا ختنہ ہوا تو بہ مطابق اناجیل زندگی کے آخری ایام میں آپ نے موسوی شریعت کی عید الفسح بھی منائی اور سبت کے متعلق یہودیوں کی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ سبت کے دن دنیوی کام ہی ممنوع ہیں اور نیکی کرنا روا ہے اور آپ نے کبھی بھی سبت کو منسوخ قرار نہیں دیا تو ہمارے مسیحی بھائی ہی اس امر کی وضاحت کے پابند ہیں کہ انہوں نے پولس کے زیر اثر موسوی شریعت کے ان احکام کو کیسے منسوخ کر دیا؟ اگر حضرت یسوعؑ نے ختنے، سبت، موسوی شریعت کے دیگر بڑے احکام اور عیدوں کو منسوخ کیا ہوتا تو

آپ کے عروج آسمانی کے بعد حواریوں میں بھلا یہ اختلاف اور یہ بحث کیوں پیدا ہوتی کہ غیر اسرائیلیوں (Gentiles) کے لئے موسوی شریعت کے سخت احکام برقرار رکھے جائیں یا فی الحال ان پر یک دم بوجھ نہ ڈالا جائے۔ عیسائی حضرات کسی ایک اصل حواری کی نشاندہی فرمائیں جس نے ختنے، سبت، عید الفسح اور حلال وحرام کے متعلق موسوی شریعت کے احکام پر عمل چھوڑ دیا ہو۔ مثلاً خنزیر کھانا شروع کر دیا ہو۔ اپنے بچوں کے لئے ختنے کی رسم کو خیر باد کہہ دیا ہو۔ پولس کو ان سچے حواریوں سے ہمیشہ یہی شکایت تو رہی ہے کہ وہ حضرت یسوعؑ کے طریقے پر مثلاً ختنے کی رسم پر کیوں قائم ودائم ہیں اور کیوں غیر مختونوں کو ناپسند کرتے ہیں؟ چنانچہ وہ حضرت یسوعؑ کے سب سے بڑے حواری پطرس کے متعلق اپنے غیظ وغضب کا اپنے ایک خط میں یوں اظہار کرتا ہے: ''لیکن جب کیفا (یعنی پطرس) انطاکیہ آیا تو میں نے روبرو ہو کر اس کی مخالفت کی کیونکہ وہ ملامت کے لائق تھا۔ اس لئے کہ یعقوب کی طرف سے چند شخصوں کے آنے سے پہلے تو وہ غیر قوم والوں کے ساتھ کھایا کرتا تھا۔ مگر جب وہ آ گئے تو مختونوں سے ڈر کر باز رہا اور کنارہ کیا اور باقی یہودیوں نے بھی اس کے ساتھ ہو کر ریاکاری کی۔ یہاں تک کہ برنباس بھی ان کے ساتھ ریاکاری میں پڑ گیا''۔ (۳۵/الف) غور کیجئے کہ پطرس حواری جو حضرت یسوعؑ کی دنیوی زندگی میں عمر بھر ان کا ساتھی رہا وہ تو (معاذ اللہ) ملامت کے لائق اور ریاکار ہو گیا کہ وہ غیر مختونوں کو ناپسند کرتا تھا اور پولس حضرت یسوعؑ کی زندگی میں عمر بھر ان کا اور ان کے سچے حواریوں اور ساتھیوں کا بدترین دشمن رہا اور انہیں ایذائیں پہنچاتا رہا اور حضرت یسوعؑ کے رفع سماوی کے بعد بھی ایک مدت تک اس کا یہی وطیرہ رہا اور پھر اس نے حضرت یسوعؑ کا رسول ہونے کا جھوٹا دعویٰ کر دیا اور یہ ظاہر کیا کہ اسے حضرت یسوعؑ کے حواریوں کی ضرورت ہی نہیں، وہ ''مخلص اور پکا مومن'' ہو گیا۔ وہ گلتیوں کے نام خط میں لکھتا ہے:

''جس خدا نے مجھے میری ماں کے پیٹ ہی سے مخصوص کر لیا اور اپنے فضل سے بلا لیا، جب اس کی مرضی یہ ہوئی کہ اپنے بیٹے کو مجھ میں ظاہر کرے تا کہ میں غیر قوموں میں اس کی خوشخبری دوں تو نہ میں نے گوشت اور خون سے صلاح لی اور نہ یروشلم میں ان (حواریوں) کے پاس گیا جو مجھ سے پہلے رسول تھے بلکہ فوراً عرب کو چلا گیا پھر وہاں سے دمشق کو واپس آیا''۔ (۳۵/ب)

اگر پولس کو خدا نے واقعی اس کی ماں کے پیٹ ہی سے مخصوص کر لیا تھا تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ حضرت یسوعؑ کی زندگی میں ان کا اور ان کے حواریوں کا موذی دشمن ثابت ہوتا۔ پس ہمارے نزدیک پولس جھوٹا ہے اور حضرت یسوعؑ کا وہ سرے سے حواری ہے ہی نہیں۔ الغرض جب حضرت یسوعؑ اور ان کے سچے حواری عمر بھر موسوی شریعت کے احکام پر عمل کرتے رہے تو اس گتھی کو ہمارے مسیحی بھائی ہی

سلجھائیں کہ انہوں نے تورات کے احکام کو کیسے منسوخ قرار دے ڈالا اور مسلمانوں پر نسخ کا اعتراض کرتے ہوئے وہ خود اپنی حالت پر غور کیوں نہیں کرتے؟ نسخ احکام کا قرآنی تصور عقل و شریعت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے جب کہ تورات کے احکام کی منسوخی کا مسیحی تصور سخت قابل اعتراض ہے۔ باقی رہا یہ شبہہ کہ حضرت یسوعؑ نے تورات کے متعلق بہ مطابق انجیل متی یہ بھی فرمایا تھا کہ: ''جب تک زمین اور آسمان ٹل نہ جائیں، ایک لفظ یا ایک شوشہ ہرگز تورات سے نہیں ٹلے گا جب تک کہ سب کچھ پورا نہ ہو جائے''۔ (۳۵/ج)

تو یہاں بھی اعتراض ہم اہلِ اسلام پر ہرگز وارد نہیں ہوتا۔ ہم تو ان اناجیل کو محرف مانتے ہیں۔ یہاں ''جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں'' کے کلمات کسی کے ذوقِ تحریف کا نتیجہ ہو سکتے ہیں البتہ یہاں عیسائیوں پر نہایت قوی اشکال اور اعتراض وارد ہوتا ہے کہ حضرت یسوعؑ کے مذکورہ مبینہ فرمان کے باجود انہوں نے مثلاً خنزیر کو اپنے لئے کیسے حلال کر لیا اور سبت کے دن کا احترام انہوں نے کیوں چھوڑ دیا؟ یہاں عیسائیوں کی یہ تاویل بالکل لغو اور لچر ہے کہ حضرت یسوعؑ نے مذکورہ مضمون کے آخر میں یہ بھی فرمایا تھا ''جب تک کہ سب کچھ پورا نہ ہو جائے'' اس لئے موسوی شریعت بہ قول ان کے حضرت یسوعؑ کی تشریف آوری پر پوری ہوگئی یعنی منسوخ ہوگئی اور نیا عہد نامہ آ گیا۔ اگر اس کا مطلب یہی تھا تو یہ کلمات ''جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں'' قطعاً غیر متعلق اور لایعنی ٹھہرتے ہیں۔ نیز یہ معنٰی لینے کی صورت میں حضرت یسوعؑ ہرگز یہ نہ فرماتے کہ میں تورات اور نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں بلکہ آپ کھلم کھلا موسوی شریعت کے منسوخ ہونے کا یوں اعلان فرماتے کہ میرے آنے سے چونکہ موسوی شریعت پوری ہو چکی لہٰذا میں اسے منسوخ کرتا ہوں اور آپ آخر عمر تک ہرگز موسوی شریعت پر عمل پیرا نہ رہتے اور اپنے آخری ایام میں بہ مطابق اناجیل یہودیوں کی عید الفسح یا عید الفطیر ہرگز نہ مناتے۔ آپ نے موسوی شریعت کے بعض احکام مثلاً احکام عشرہ کے متعلقہ مسائل میں جو قدرے کمی بیشی فرمائی جس کا تذکرہ مثلاً انجیل متی میں موجود ہے (۳۶/ الف) اسی کو انہوں نے شریعت موسوی کی تکمیل اور شریعت عیسوی کی تشکیل کا نہ کہ تنسیخ کا نام دیا ہے یہی ان کا بنی اسرائیل سے نیا عہد تھا جس میں بطور خاص خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بھی شامل تھا، جن کی تشریف آوری کی بشارتیں حضرت موسیٰ اور اسرائیل انبیاء نے عموماً اور آخری اسرائیلی پیغمبر حضرت یسوعؑ نے خصوصاً دے رکھی تھیں۔ خدا کے بعض احکام لوگوں کی نافرمانی اور سرکشی وغیرہ کی وجہ سے کسی شریعت میں سخت اور بعد میں حسبِ ضرورت و مصلحت نرم ہو سکتے ہیں لیکن (معاذ اللہ) ناقص یا لوگوں کے لئے لعنت نہیں ہوا کرتے۔ البتہ تورات کے

کچھ احکام ایسے ہیں جو واقعی دائمی ہیں اور کبھی منسوخ نہیں ہوئے، مثلاً توحید، رسالت اور آخرت کے متعلق صحیح عقائد کبھی بلکہ کسی بھی شریعت میں منسوخ نہیں ہوئے۔ اور مثلاً جھوٹی قسم کھانا، زنا، سدومیت (مردوں کی مردوں سے بدکاری) پڑوسی کے مال وآبرو میں خیانت، دھوکہ، جھوٹ، غیبت وتہمت لگانا وغیرہ کبھی بھی کسی بھی شریعت میں جائز نہیں ہوئے۔ والدین کا احترام واکرام وغیرہ احکام تمام شرائع میں موجود رہے ہیں۔ باپ، دادا، بیٹوں، چچاؤں، ماموؤں، پھوپیوں، خالاؤں سے اور دو حقیقی بہنوں سے ایک ہی وقت میں نکاح حرام ہونا وغیرہ موسوی شریعت کے احکام ناقابلِ تنسیخ ہیں اور شریعت محمدیہ میں بھی بحال رکھے گئے ہیں۔

ہمارے نزدیک چونکہ اناجیل بھی محرّف ہیں لہٰذا ان میں موجود اس طرح کے احکام کی نسبت ہم یسوعؑ کی طرف صحیح نہیں سمجھتے کہ ہر گناہ گار ٹھوکر کھانے والی اپنی داہنی آنکھ کو نکال کر کانا، اپنا ایک بازو کاٹ کر ٹنڈا اور ٹھوکر کھانے والی داہنی ٹانگ کو کاٹ کر لنگڑا ہو جائے۔ ایسے احکام غیر فطری ہیں اور انسانی عملی زندگی کے تقاضوں سے ہرگز ہم آہنگ نہیں ہیں۔ عیسائیوں نے آج تک ان احکام پر عمل کر کے کبھی نہیں دکھایا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ان محرّف اناجیل کو مقدس اور الہامی قرار دے رہے ہیں۔

(۹) اختلافِ مضامین

ہم اس سلسلۂ مضامین میں عنوان ''بائبل میں اغلاط و تضادات کے چند نمونے'' کے تحت بیان کر چکے ہیں کہ بائبل کے محرّف ہونے کا نہایت کھلا اور واضح ثبوت یہ ہے کہ اس کے مضامین میں ایسا اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے جسے کسی طرح دور نہیں کیا جا سکتا، مثلاً اور نہیں تو حضرت یسوعؑ کے نسب نامے ہی کو لے لیجئے جو اناجیل متی اور لوقا میں موجود ہے۔ اسی طرح حضرت یسوعؑ کی مصلوبیت کا جو واقعہ اناجیل میں مذکور ہے اس کے بہت سے تضادات اور اختلافات ہی اسے جھوٹا ثابت کرتے ہیں۔ (۳۶/ب) اور قرآن کریم میں ہے کہ یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے اگر یہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس (کے مضامین) میں بہت سا اختلاف پاتے (۳۶/ج) یہاں مضامین میں جس اختلاف اور تعارض کی بات ہو رہی ہے، اس سے مراد ایسا اختلاف ہے جو حقیقی ہو اور اس کو دور کرنا کسی طرح بھی ممکن نہ ہو۔ اس طرح کا حقیقی تعارض سچے کلام میں ہرگز نہیں ہو سکتا لہٰذا محرّف بائبل کے برعکس قرآن کریم اس عیب سے ہرگز آلودہ نہیں ہے۔ بعض اوقات کلام میں تعارض اور اختلاف حقیقی ہوتا ہی نہیں محض ظاہری ہوتا ہے جسے دور کیا جا سکتا ہے اور بہ ظاہر مختلف دکھائی دینے والے اقوال میں تطبیق (مطابقت

پیدا کرنا) بآسانی یا قدرے غور وتامل سے ممکن ہوا کرتی ہے۔ کلام میں اس طرح کے غیر حقیقی تعارض سے بعض اوقات لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قرآن کریم کے بہ ظاہر متضاد نظر آنے والے بعض مضامین ان میں معقول تطبیق کی متعدد مثالیں پیش کی جاتی ہیں اور بعض ان اعتراضات کا بھی تعاقب کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کے بعض مضامین (معاذ اللہ) خارجی حقائق سے ہم آہنگ نہیں ہیں:

۱۔ سورہ تحریم میں ہے کہ (اللہ نے مثال بیان فرمائی) مریم بنت عمران کی، جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی (۳۷/ الف) عیسائیوں کا اعتراض یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن میں حضرت عیسیٰ کو روح اللہ کہا گیا ہے اور دوسری طرف ان کی الوہیت (خدائی) کا انکار بھی کیا گیا ہے۔ یہاں حضرت عیسیٰ کو اللہ کی روح اس لئے کہا گیا ہے کہ اس سے ان کا شرف واحترام لوگوں پر واضح ہو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ ''کُن (ہوجا)'' کہنے سے معجزانہ طور پر اپنی ماں مریم سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ یعنی یہ اضافتِ تشریفیہ ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (معاذ اللہ) اپنی روح کا کچھ حصہ حضرت مریمؑ کے بطن میں ڈال دیا تھا۔ حضرت آدمؑ بغیر ماں اور باپ کے پیدا ہوئے۔ ان کے متعلق بھی قرآن کریم میں مثلاً سورہ ص میں ملائکہ کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جب میں اس (آدم) کو درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے سامنے (عزت واحترام کے) سجدے میں گر پڑنا (۷۲/ ب) دیکھئے حضرت آدمؑ کے متعلق بھی یہی قرآنی مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر اپنی روح پھونکی۔ اس سے حضرت آدمؑ الوہیت (خدائی) کے مرتبے پر فائز نہیں ہوگئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق سورہ نساء میں ہے کہ مسیح عیسیٰ بن مریم تو صرف اللہ کا رسول ہے اور اس کا کلمہ (یعنی کُن بمعنیٰ ہوجا سے پیدا ہونے والا) ہے جسے اس نے مریم کی طرف ڈال دیا تھا اور اس کی طرف سے ایک روح ہے (۷۲/ ج) یہاں آیت میں ''روح منہ'' کے کلمات سے واضح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کی طرف سے ایک روح ہیں نہ کہ وہ اللہ کی روح کا (معاذ اللہ) کوئی جز ہیں۔ نیز سورہ آلِ عمران میں ہے کہ بلاشبہ عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال کی طرح ہے۔ اس نے اس کو مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا ہوجا، تو وہ (زندہ انسان) ہوگیا (۳۸/ الف) اگر قرآنی کلمات ''روحنا'' (ہماری روح) اور ''روحی'' (میری روح) سے الوہیت ثابت ہوتی تو حضرت آدمؑ کو تو بہ طریق اولیٰ (معاذ اللہ) خدا ہونا چاہئے۔ حالانکہ عیسائی حضرات انہیں خدا کہنا تو درکنار بزعم خویش بڑا گناہ گار تصور کرتے ہیں۔ تخلیق آدمؑ کے متعلق بائبل میں ہے۔ ''اور خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا تو انسان جیتی جان ہوا'' (۳۸/ ب) حضرت عیسیٰؑ کو بھی اس معنیٰ میں قرآن کریم میں ''وروح

منہ'' (اور اس کی طرف سے ایک روح) کہا گیا ہے کہ ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کے بطن میں اللہ تعالیٰ نے زندگی کا دم پھونک دیا۔ اسی کو ونفخنا فیہ من روحنا (اور ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی) کہا گیا ہے۔ اس سے حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت (ہرگز) ثابت نہیں ہوتی۔ قرآن کریم کے مضامین میں یہاں کوئی تعارض نہیں ہے۔

۲۔ سورہ حٰمٓ سجدہ میں ہے کہ وہی (اللہ) آسمان سے زمین تک (کے) ہر کام کا انتظام کرتا ہے پھر وہ (کام) اس کی طرف ایک دن میں اوپر لوٹتا ہے جس کی مقدار تمہارے شمار کے حساب سے ایک ہزار سال کے برابر ہے (۳۸/ ج) اور سورہ معارج میں ہے کہ فرشتے اور روح اس کی طرف ایک دن میں چڑھتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہے (۳۹/ الف) دونوں آیات کا تعلق بالکل دو مختلف امور سے ہے۔ پہلی آیت کا تعلق انتظامی معاملات اور تقدیر سے ہے کہ ان امور کے اثرات مثلاً لوگوں کے نیک و بد اعمال جو اوپر جاتے ہیں اس کے ایک دن کی مدت زمینی سالوں کے حساب سے ایک ہزار سال ہے۔ دوسری آیت میں ہے کہ فرشتے زمین سے آسمانوں میں اوپر انتہائی بالائی مقام تک پچاس ہزار سالوں میں جاتے ہیں۔ اس طویل مدت کا شمار زمینی سالوں کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں پر اس زمینی مدت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان کے لئے تو یوں سمجھئے کہ یہ صرف ایک دن کی مدت ہے۔

ہمارے نظامِ شمسی کے سیاروں ہی کو لیجئے۔ ان کے سالوں کی مدت میں باہم خاصا فرق ہوسکتا ہے مثلاً سیارہ پلوٹو کا ایک سال ہمارے زمینی سالوں کے شمار سے کوئی ۲۴۸ سالوں کا ہوتا ہے۔ چونکہ زیرِ بحث آیات میں مدت کا تعلق دو بالکل مختلف امور سے ہے اس لئے ان میں کوئی حقیقی تعارض نہیں۔

۳۔ قرآن کریم میں مشرق و مغرب کا ذکر ہے مثلاً سورہ مزمل میں اللہ تعالیٰ کو رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (مشرق اور مغرب کا رب) کہا گیا ہے (۳۹/ ب) دو مشرقوں اور دو مغربوں کا بھی ذکر ہے مثلاً سورہ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ کو رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ کہا گیا ہے (۳۹/ ج) اور کئی مشرقوں (مشارق) اور کئی مغربوں (مغارب) کا بھی قرآن کریم میں ذکر ہے مثلاً سورہ معارج میں اللہ تعالیٰ کو ربُّ المشارق و المغارب کہا گیا ہے (۴۰/ الف) ان مضامین میں بھی کوئی حقیقی تعارض نہیں۔ اس لحاظ سے کہ سورج مشرق سے نکلتا اور مغرب میں غروب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کو مشرق و مغرب کا رب کہا گیا ہے۔ سورج کے مشرق سے نکلنے اور مغرب میں غروب ہونے کے باوجود اس کے طلوع و غروب کے مقام میں روزانہ بہ تدریج تبدیلی ہوتی رہتی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ کو رب المشارق والمغارب بھی کہا گیا ہے۔ زمین کے مثلاً شمالی نصف کرہ میں کوئی ۲۱ مارچ اور ۲۳ ستمبر کو اعتدال ربیعی اور اعتدال خریفی (Vernal &

(Autumnal Equinox) کو سورج خطِ استواء پر سفر کرتا ہے۔ یوں سال میں دو مرتبہ دن اور رات برابر ہو جاتے ہیں اور سورج بالکل مشرق سے طلوع ہوتا اور مغرب میں غروب ہوتا ہے باقی دنوں میں شمالاً جنوباً جگہ بدلتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کو رب المشرقین اور رب المغربین کہا جاتا ہے۔ لہٰذا قرآنی مضامین میں کوئی حقیقی تعارض نہیں ہے۔

۴۔ عقل کا تعلق دماغ سے ہے قرآن کریم اسے قلب سے جوڑتا ہے مثلاً سورہ محمد میں ہے کہ وہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے یا کیا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟ (۴۰/ ب) تقریباً دنیا بھر کے لسانی محاورات میں دل کو عقل کے قائم مقام رکھا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ میں آپ کو اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ انگریزی محاورہ ہے To learn by heart جس کا معنی ہے ''زبانی یاد کرنا'' حالانکہ یاد کرنے کا تعلق دماغ سے ہے۔ قرآن کریم میں لوگوں کے لسانی محاورات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۵۔ سورہ کہف سے ثابت ہے کہ ابلیس جنات میں سے ہے (۴۰/ ج) اگر مثلاً پندرہ بیس مردوں کے ساتھ ایک دو خواتین بھی ہوں تو تعداد میں زیادہ ہونے کے باعث مردوں کو مخاطب کیا جائے گا اور عورتیں اس خطاب میں ضمناً شامل ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے (عزت و احترام کا) سجدہ کرو۔ ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا (۴۱/ الف) چونکہ جنات کے سردار ایک ابلیس کے مقابلے میں فرشتے بہت بڑی تعداد میں تھے اس لئے فرشتوں کو مخاطب کیا گیا۔ ابلیس اس خطاب میں ضمناً شامل تھا۔ یہاں قرآنی مضامین میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

۶۔ حضرت موسیٰؑ کے کوہ طور پر تشریف لے جانے کے بعد ان کی عدم موجودگی میں ایک سامری نے ایک بچھڑے کا بت تیار کر کے بنی اسرائیل کو اس کی عبادت کی دعوت دی (۴۱/ ب) یہ شخص سامرہ شہر کا باشندہ نہیں تھا۔ یہ شہر تو حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں موجود ہی نہیں تھا۔ بلکہ سامری کا تعلق سمیری قوم سے تھا۔ عربی زبان میں اس کا نام قدیم سے سامری چلا آ رہا ہے اور اب بھی عراق میں ان کا بقایا اسی نام سے پکارا جاتا ہے (۴۱/ ج) لہٰذا بعض شرق شناسوں کا اعتراض غیر متعلق ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے اصل مخاطب گو بنی اسرائیل تھے۔ لیکن ان کے علاقوں میں موجود دوسری اقوام بھی ضمناً مخاطب تھیں چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو بھی حق قبول کرنے کی دعوت دی تھی حالانکہ ان کا تعلق قبطی قوم سے تھا، وہ اسرائیلی نہیں تھے۔

۷۔ مشرکین مکہ نے یہودیوں کے کہنے پر رسول اکرم ﷺ سے حضرت یوسفؑ، ذوالقرنین اور اصحاب کہف کے واقعات سے متعلق پوچھا تھا۔ غار میں اصحاب کہف کے قیام کی مدت کے متعلق سورہ

کہف میں ہے کہ وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور لوگوں نے (اس مدت میں) نو سال (اور) بڑھائے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ اللہ ہی خوب جانتا ہے جتنی مدت وہ (غار میں) ٹھہرے رہے۔ آسمانوں اور زمین کا غیب اسی کو حاصل ہے وہ کیا ہی اچھا دیکھنے اور سننے والا ہے۔ (۴۲/ الف) چونکہ پوچھنے والوں کے خیال میں غار میں اصحابِ کہف کے قیام کی مدت تین سو شمسی اور تین سو نو قمری سال تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے وہی بیان کردی تاکہ انہیں یہ وسوسہ نہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ صحیح مدت نہیں بتا سکے اور تاکہ انہیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کے بھیدوں سے باخبر ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ کہہ کر کلام میں معنیٰ خیز ابہام بھی پیدا کر دیا کہ اللہ ہی غار میں ان کے قیام کی صحیح مدت کو جانتا ہے کیونکہ آسمانوں اور زمین کی لوگوں سے چھپی باتیں اسی کو معلوم ہیں۔ اس لئے اگر بالفرض غار میں قیام کی صحیح مدت تین سو سال سے کم وبیش ہو تو بھی قرآن کریم پر اشکال وارد نہیں ہوتا کیونکہ اگر نزول قرآن کے وقت لوگوں کو بتایا جاتا کہ یہ مدت مثلاً ایک سو چھیانوے سال ہے (جیسا کہ بعض مستشرقین کا دعویٰ ہے) تو لوگ فوراً یہ کہتے کہ محمد ﷺ صحیح مدت بتانے سے قاصر رہے اور اگر انہیں یہ بتایا جاتا کہ صحیح مدت تو یہ ہے اور تمہارا یہ خیال درست نہیں کہ یہ مدت تین سو سال ہے تو بھی ایک غیر ضروری بحث چھڑ جاتی اور اصل مقصد فوت ہو جاتا۔ پس قرآن کریم پر بعض مستشرقین کا اعتراض درست نہیں۔

۸۔ سورہ مریم میں ہے کہ لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں یا اختَ ہارون (اے ہارون کی بہن) کہا تھا (۴۲/ ب) یہاں ضروری نہیں کہ ہارون سے حضرت مریمؑ کا کوئی حقیقی بھائی مراد ہو۔ عرب محاورات میں مثلاً قبیلہ مُضر کے شخص کو یا اخا مُضر (اے مضر کے بھائی) اور قبیلہ تمیم کے شخص کو یا اخا تمیم (اے تمیم کے بھائی) کہہ دیا جاتا ہے تو اختِ ہارون سے مراد بنی اسرائیل کے نہایت معزز خاندان بنی ہارون کی لڑکی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت مریمؑ کے خاندان میں ان دنوں ہارون نام کا ان کا قریبی رشتہ دار کوئی نیک اور پرہیز گار شخص موجود ہو۔ بہر حال یہاں ہارون سے حضرت موسیٰؑ کے بھائی حضرت ہارونؑ مراد نہیں لوگ عموماً اپنے بچوں کے نام برکت کے لئے اپنے بزرگ اسلاف کے ناموں پر رکھتے ہیں۔ اناجیل میں حضرت یسوعؑ نے بارہا اپنے آپ کو ابنِ آدم کہا ہے یہاں اس سے نسل مراد ہے۔ یعنی آپ حضرت آدمؑ کی نسل اور اولاد سے ہیں ورنہ متی اور لوقا نے آپ کا نسب نامہ بیان کرتے ہوئے آپ کو یوسف نجار کا بیٹا ظاہر کیا ہے۔ کسی شخص کے دو حقیقی باپ نہیں ہو سکتے۔ تو ابن (بیٹے) کی طرح اخ اور اخت (بھائی اور بہن) کے مفہوم میں بھی بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ حقیقی معنیٰ اگر کسی وجہ سے مراد نہ لیا جا سکے تو مجازی معنیٰ کی لسانی محاورات کے مطابق پوری

گنجائش موجود ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے والد کا نام عمران تھا۔ بہ مطابق قرآن کریم حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کے والد کا نام بھی عمران ہے (۴۲/ ج) ناموں کے مشترک ہونے سے کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ اہل کتاب کو اعتراض کا حق تب ہی ہوسکتا ہے اگر وہ قطعیت سے ثابت کردکھائیں کہ حضرت مریمؑ کے والد کا فلاں نام تھا۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے فرعون کے وزیر کا نام ہامان مذکور ہے (۴۳/ الف) بائبل کی کتاب آستر میں بھی ایک شخص کا نام ہامان دیا گیا ہے (۴۳/ ب) دو بلکہ دو سے بھی زیادہ اشخاص کے ناموں کے مشترک ہونے میں قطعاً کوئی عقلی اشکال نہیں اور ایسا ہونا ناممکنات سے نہیں کہ بعض مستشرقین کو تشویش لاحق ہو اور قرآن کریم پر بیجا بلکہ مضحکہ خیز اعتراض کریں۔

۹۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا (۴۳/ ج) سورہ فصلت میں ہے کہ (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ کیا تم اس (اللہ) کا انکار کرتے ہو اور تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو جس نے دو دن میں زمین پیدا کردی، وہی سارے جہانوں کا رب ہے اور اس نے زمین میں اس کے اوپر سے پہاڑ گاڑ دیئے اور اس میں برکت رکھ دی اور اس میں (رہنے والوں کے لئے) غذائیں بھی اسی میں رکھ دیں (یہ سب کچھ) چار دنوں میں (ہوا) پوچھنے والوں کے لئے (حساب) برابر ہوا۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا پس اسے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں خوشی سے آؤ یا ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آتے ہیں (یعنی اطاعت قبول کرتے ہیں) تو اس نے دو دن میں سات آسمان بنادیئے اور ہر آسمان میں اس کے کام کا حکم بھیجا اور ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے مزین کیا اور (شیاطین سے) محفوظ کیا۔ یہ غالب و دانا (اللہ) کی تدبیر ہے (۴۴/ الف) اس قرآنی مضمون کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ زمین کی تخلیق (پیدا کرنا) اور چیز ہے اور اس کا دحو (بچھانا اور پھیلانا) اور چیز ہے۔ زمین کی دو دنوں میں تخلیق آسمانوں سے پہلے ہوئی۔ دو دنوں میں آسمانوں کی تخلیق کے بعد زمین کا دو دنوں میں دحو (پھیلاؤ) بعد میں ہوا (۴۴/ ب) سورہ بقرہ میں ہے کہ وہ (اللہ) وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں ٹھیک ٹھیک سات آسمان بنادیا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے (۴۴/ ج) اس سے معلوم ہوا کہ آسمانوں سے پہلے زمین کی تخلیق ہوئی اور اس میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ لیکن زمین کو ہموار کرنے اسے پھیلا کر اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد کو بروئے کار لانے کا عمل آسمانوں کی تخلیق کے بعد ہوا چنانچہ سورہ نازعات میں ہے کہ کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ اس

(اللہ) نے اسے بنایا اور اس کی بلندی اونچی کی پھر اسے ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو نکالا اور اس کے بعد زمین کو بچھا دیا۔ اس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو مضبوط گاڑ دیا۔ یہ سب تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لئے ہے (۴۵/ الف) سورہ فصلت/حم سجدہ میں زمین کی تخلیق اور اس کے دحو (پھیلاؤ) کو یک جا بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ سارا کام چار دنوں میں پورا ہوا جیسا کہ آیت میں ''سواللسائلین'' کے کلمات سے واضح ہے کہ پوچھنے والوں کے لئے حساب برابر ہوا۔ زمین کی تخلیق اور اس کے دحو (پھیلاؤ) کے درمیان دو دنوں میں آسمانوں کی تخلیق ہوئی۔ زمین کا دحو (پھیلاؤ اور ہم واری کا کام) بعد میں اس لئے ہوا کہ اس کا تعلق دیگر اجرام فلکی مثلاً سورج سے بھی ہے۔ زمین پر رات اور دن کا آنا جانا اسی سے ہے۔ اسی طرح زمین پر بارش اوپر سے برستی ہے اور زمین اس پانی کو اپنے اندر جذب کر کے ذخیرہ کر لیتی ہے۔ الغرض قرآنی مضامین میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ سورہ فصلت/حم سجدہ کی متعلقہ آیات میں ''سواءللسائلین'' کا ترجمہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ زمین کی غذائیں وغیرہ سب ضرورت مندوں کے لئے یک ساں کارآمد ہیں۔ کلام میں متعدد معانی کا ہونا جب کہ ان میں تضاد نہ ہو، کمال ہے عیب نہیں۔

۱۰۔ سورہ انعام میں ہے کہ (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلا اللہ کا فرماں بردار میں خود بنوں..... (۴۵/ ب) یہاں رسول اللہ ﷺ کو اول المسلمین یعنی (اللہ کا) سب سے پہلا مسلم (فرماں بردار) کہا گیا ہے۔ اور سورہ اعراف میں حضرت موسیٰؑ کا یہ قول مذکور ہے وانا اول المؤمنین (۴۵/ ج) کہ میں سب سے پہلا مومن ہوں۔ ان مضامین میں کوئی تضاد نہیں۔ ہر پیغمبر اپنی امت کو دعوتِ ایمان و اسلام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خود سب سے پہلے اللہ کا مسلم یعنی فرماں بردار ہوگا تب ہی تو وہ دوسروں کو اس کی دعوت دے گا۔ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے لئے مبعوث ہوئے تو انہیں دعوتِ ایمان دینے سے پہلے وہ خود مومن تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت عالمی اور آفاقی ہے گو آپ کے اولین مخاطب عرب تھے، اس لئے دوسروں کو دعوتِ اسلام دینے سے پہلے آپ خود بھی مسلم تھے۔

۱۱۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ (ماؤں کی) بچہ دانیوں میں جو کچھ ہے اللہ ہی اسے جانتا ہے (۴۶/ الف) اس سے بچے کے نر و مادہ ہونے کا علم ہی مراد نہیں بلکہ اس بچے کے زندگی بھر کے تمام متعلقات مراد ہیں مثلاً وہ نیک بخت ہوگا یا بد بخت، اسے روزی کتنی اور کہاں کہاں سے حاصل ہوگی، اس کی عمر کتنی ہوگی، اس کی اولاد ہوگی یا نہیں، اس کی نسل آگے چلے گی یا نہیں، وہ خوب صورت اور صحت مند ہوگا یا بد صورت و بیمار ہوگا وغیرہ وغیرہ لاتعداد امور کا یقینی اور حتمی علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔

۱۲۔سورہ روم میں ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا (۴۶/ ب) اور دوسرے مقام پر مثلاً سورہ یٰسین میں ہے کہ ہم نے انسان کو نطفے (منی) سے پیدا کیا ہے (۴۶/ ج) اور ایک اور مقام پر مثلاً سورہ فرقان میں ہے کہ ہم نے انسان کو پانی سے پیدا کیا ہے (۴۷/ الف) ان آیات میں کوئی حقیقی تعارض نہیں کیونکہ مٹی، پانی اور نطفہ تینوں جمع ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابوالبشر حضرت آدمؑ کو ماں باپ کے بغیر مٹی سے پیدا فرمایا۔ انسانی جسم میں جتنے مرکبات پائے جاتے ہیں وہ سب مٹی میں موجود ہیں۔ انسانی جسم میں پانی کی کافی مقدار بھی موجود ہے اور زمین بھی اپنے اندر پانی کو ذخیرہ کئے ہوئے ہے، نطفے میں بھی پانی موجود ہوتا ہے۔

۱۳۔سورہ نساء میں ہے کہ اگر ان (منافقین) کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور انہیں کوئی برائی پہنچے تو کہتے ہیں کہ (اے محمد ﷺ) یہ تیری طرف سے ہے۔ (اے پیغمبر!) تو (ان سے) کہہ دے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ تو ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ کسی بات کو سمجھنے کے قریب بھی نہیں پہنچتے۔ (اے انسان) تجھے جو بھلائی بھی پہنچے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچے وہ تیری (اپنی) طرف سے ہے اور (اے محمد ﷺ) ہم نے تجھے لوگوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور اس پر اللہ بطور گواہ کافی ہے (۴۷/ ب) اس قرآنی مضمون سے معلوم ہوا کہ نفع ہو یا نقصان دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں کیونکہ وہی مسبّب الاسباب اور وہی مؤثر حقیقی ہے۔ البتہ کسی انسان کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ بسا اوقات اس کے اپنے بُرے اعمال کے اثرات ہوتے ہیں اس لئے اس کی نسبت خود اس انسان کی طرف کر دی جاتی ہے کہ یہ تیری ہی طرف سے یعنی تیرے بُرے اعمال کی وجہ سے ہے۔ چونکہ اچھے یا برے اعمال میں اچھا یا برا اثر اللہ ہی نے رکھا ہے اس لئے یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ بھلائی ہو یا برائی، نفع ہو یا نقصان، سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ یہاں کلام میں کوئی حقیقی تضاد یا تعارض نہیں ہے۔

۱۴۔سورہ زمر میں ہے کہ کسی کی موت کے وقت اللہ اس کی روح قبض کرتا ہے (۴۷/ ج) اور سورہ سجدہ میں ہے کہ تمہاری روح (موت کا) وہ فرشتہ قبض کرتا ہے جو تم پر مقرر کیا گیا ہے (۴۸/ الف) سورہ انعام میں ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی روح قبض کر لیتے ہیں (۴۸/ ب) اور مثلاً سورہ انفال میں بھی اسی طرح کا مضمون ہے کہ جب فرشتے کفار کی روح قبض کرتے ہیں تو وہ ان کے منہ اور پیٹھوں پر مارتے ہیں (۴۸/ ج) ان مضامین میں بھی کوئی حقیقی تعارض نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اسباب کا کارخانہ بنایا ہے۔ چونکہ مسبّب الاسباب اور مؤثر

حقیقی وہی ہے اس لئے کاموں کی نسبت کبھی اللہ کی طرف کردی جاتی ہے تو کبھی لسانی محاورات کے مطابق درمیان کے اسباب یا سببِ قریب کی طرف بطور اسنادِ مجازی کردی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عزرائیلؑ کو موت کا فرشتہ مقرر کیا ہے جو اس کے حکم سے لوگوں کی ارواح قبض کرتا ہے۔ اس لئے روح قبض کرنے کی نسبت کبھی اس کی طرف کردی جاتی ہے۔ موت کے اس فرشتے کے ماتحت لاتعداد فرشتے ہیں۔ نیک لوگوں کی روح رحمت کے فرشتے اور کفار کی روح عذاب کے فرشتے قبض کرتے ہیں لہٰذا روح قبض کرنے کی نسبت لسانی محاورات کے مطابق کبھی فرشتوں کی طرف کردی جاتی ہے۔

۱۵۔ سورہ رحمٰن میں ہے کہ اس (قیامت کے) دن کسی انسان اور جن سے اس کے گناہوں کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا (۴۹/ الف) اور دوسرے مقام پر مثلاً سورۂ حجر میں ہے کہ تیرے رب کی قسم، ہم ان سب سے ضرور پوچھیں گے (۴۹/ ب) اس طرح کے مضامین میں بھی کوئی حقیقی تضاد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ یعنی غیب اور حاضر کو جاننے والا ہے اس لئے بروز قیامت کسی سے بھی کوئی سوال تفتیش اور معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ہرگز نہیں پوچھا جائے گا لیکن مجرموں پر الزام قائم کرنے کے لئے ان سے ضرور باز پرس ہوگی۔ ہاں اگر اللہ کسی کو معاف فرمادے اور اس کا حساب آسان کردے تو اور بات ہے۔

۱۶۔ سورہ نساء میں ہے کہ لوگ قیامت کے دن اپنی کوئی بات اللہ تعالیٰ سے چھپا نہیں سکیں گے (۴۹/ ج) اور سورہ انعام میں ہے کہ قیامت کے دن مشرکین کہیں گے کہ اللہ کی قسم ہم (دنیا میں) مشرک نہیں تھے۔ (۵۰/ الف) یہاں بھی کوئی تضاد نہیں ہے۔ مشرکین اپنے جرم کو چھپانے کی کوشش تو ضرور کریں گے لیکن اس میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے چنانچہ مثلاً سورہ یٰس میں ہے کہ ہم آج کے دن (یعنی بروز قیامت) ان کے منہ پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں ان کاموں کی گواہی دیں گے جو وہ (دنیا میں) کیا کرتے تھے۔ (۵۰/ ب)

۱۷۔ سورہ مومنون میں ہے کہ جب صور پھونک دیا جائے گا تو اس دن نہ تو آپس میں رشتے ہی رہیں گے اور نہ ہی آپس میں پوچھ گچھ ہوگی (۵۰/ ج) اور مثلاً سورہ صافات میں ہے کہ وہ (جنتی) ایک دوسرے کی طرف رخ کرکے آپس میں پوچھیں گے (۵۱/ الف) ان مضامین میں بھی کوئی حقیقی تضاد نہیں قیامت میں جب پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو اس کے شدید صدمے سے بالآخر سب بے ہوش ہوجائیں گے جیسا کہ سورہ زمر میں ہے کہ صور میں پھونک ماری جائے گی، پس آسمانوں اور زمین میں سب بے ہوش ہوکر گر پڑیں گے مگر جسے اللہ چاہے (وہ بے ہوش نہ ہوگا) (۲۱/ ب) ظاہر ہے اس حالت میں نہ رشتے کام آرہے ہوں گے اور نہ ہی لوگ باہم پوچھ گچھ کرسکیں گے۔ جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا اور

لوگ زندہ کر دیئے جائیں گے تو بعد کے مراحل میں ان میں باہم گفتگو ہوگی۔

۱۸۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں، بے شک ہدایت گمراہی سے پوری طرح ممتاز ہو گئی ہے۔ (۵۱/ ج) اور مثلاً اسی سورت میں ہے کہ تم ان (کفار) سے جنگ لڑو یہاں تک کہ فتنہ (یعنی شرارت) باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ پھر اگر وہ (شرارت سے) باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی جائز نہیں (۵۲/ الف) ان مضامین میں بھی کوئی تعارض نہیں۔ کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانا ہرگز درست نہیں لیکن اگر کفار اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فتنہ وفساد اور شرارت و بغاوت سے باز نہ آئیں تو مسلمانوں کو ان کے خلاف جنگ کا حکم ہے تا کہ فتنہ وشرارت باقی نہ رہے اور اللہ کا دین (اسلام) دشمنوں کے خطرات سے محفوظ ہو کر مضبوط و مستحکم ہو جائے۔ اسی لئے آیت میں حتیٰ لا تکون فتنۃ (یہاں تک کہ شرارت باقی نہ رہے) کے کلمات لائے گئے ہیں۔ یہ نہیں کہا گیا حتیٰ لا یکون کفر (یہاں تک کہ کفر باقی نہ رہے) کیونکہ لوگوں کو کفر سے زبردستی روکنے کی اللہ تعالیٰ نے کسی کو اجازت نہیں دی۔ اسی لئے آیت میں یہ تنبیہ بھی فرما دی گئی کہ اگر کفار فتنہ اور فساد سے باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی اور پر زیادتی نہیں ہونی چاہئے۔ البتہ ارتداد یعنی اسلام چھوڑ کر پھر کفر اختیار کر لینے کا معاملہ اس سے مختلف ہے مثلاً بائبل کے پرانے عہد نامے کی کتاب خروج میں ہے ''جو کوئی واحد خداوند کو چھوڑ کر کسی اور معبود کے آگے قربانی چڑھائے وہ بالکل نابود کر دیا جائے'' (۵۲/ ب) حضرت موسیٰؑ کے کوہ طور پر جانے کے بعد جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کر کے ارتداد کے جرم کا ارتکاب کیا تھا انہیں حضرت موسیٰؑ کے حکم کے مطابق موت کی سزا دی گئی تھی چنانچہ اسی کتاب خروج میں ہے ''اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم گھوم کر سارے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو۔ اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریباً تین ہزار مرد کھیت آئے'' (۵۲/ ج)

۱۹۔ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا اس کے وقوع سے پہلے ہی علم ہے مثلاً سورہ انعام میں ہے کہ وہ پوشیدہ اور ظاہر سب چیزوں کا جاننے والا ہے۔ (۵۳/ الف) ہر چیز کے وقوع اور ظہور کا وقت اور موقع ومحل بھی اللہ تعالیٰ کے علم، ارادے اور قدرت کے تحت ہوتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں ''علم'' کا لفظ کسی چیز کے خارج میں ظہور اور وقوع کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً سورہ آل عمران میں ہے: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ (۵۳/ ب) ''یعنی کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم جنت میں یونہی چلے جاؤ گے حالانکہ اللہ نے ابھی (ظاہری طور پر) نہیں جانا کہ تم میں سے جہاد

کرنے والے کون ہیں اور صبر کرنے والے کون ہیں''۔ یہاں نہیں جانا کا مطلب ہے کہ ظاہر نہیں کیا۔

۲۰۔سورہ طٰہٰ میں ہے کہ تم (موسیٰ اور ہارون) دونوں اس (فرعون) سے نرم بات کہنا، اس کے بعد ہے لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى کہ شاید وہ نصیحت قبول کرے یا (اللہ سے) ڈرے (۵۳/ج) یہاں ''شاید'' کا تعلق حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کو تو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ فرعون راہ راست پر نہیں آئے گا۔ آیت میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ حق کی دعوت دینے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ کلام میں نرمی اور شائستگی اختیار کریں اور یہ سمجھیں کہ اس طریقے سے لوگوں کو دعوتِ حق دینا شاید ان کے لئے مفید ثابت ہو کیونکہ درشت کلامی سے تو لوگ بدکتے اور دور بھاگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو غیب جانتا ہے کہ لوگ حق کی دعوت کو قبول کریں گے یا نہیں لیکن جو لوگ دعوتِ حق کے کام میں لگے ہوئے ہیں وہ تو نہیں جانتے۔ اس لئے آیت میں لعل بہ معنیٰ شاید کا کلمہ لایا گیا۔ پس اس طرح کے قرآنی مضامین کا بھی ان مضامین سے قطعاً کوئی تعارض نہیں ہے جن میں اللہ تعالیٰ کو عالم الغیب والشہادۃ قرار دیا گیا ہے۔

۲۱۔تعوذ کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی پڑھا جاتا ہے حالانکہ تعوذ اور تسمیہ (بسم اللہ) کے کلمات یہاں بالاتفاق قرآنی آیات کا حصہ نہیں سمجھے جاتے۔ اسی طرح ہر سورت کی ابتدا میں جو بسم اللہ آئی ہے وہ ممکن ہے اس سورت کا حصہ اور جزو ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ سورتوں کو ایک دوسرے الگ رکھنے کے لئے بسم اللہ لائی گئی ہو یعنی یہ بسم اللہ قرآنی سورتوں کے درمیان فصل کے لئے ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس علمی اختلاف سے قرآن کریم کی آیات اور سورتوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی قرأت وتلاوت میں کوئی خلل پیدا ہوتا ہے۔ جہاں تک سورہ نمل کی آیت اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے کلمات کا تعلق ہے اس کے خداوندی وحی ہونے میں کسی کا بھی قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۲۲۔سورہ طٰہٰ میں اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (۵۴/الف) کے کلمات میں ھٰذان کو رفعی حالت میں لایا گیا ہے۔ یہ عرب میں قبیلہ کنانہ کی شاخ بنی حارثؓ کی لغت ہے کہ وہ ایسی صورتوں میں تثنیہ کو رفعی نصبی اور جری تینوں حالتوں میں ''الف'' سے پڑھتے ہیں۔ نیز ھٰذان کا یہ ''الف'' دراصل الفِ تناسب بھی ہے جو ''ساحران'' کی وجہ سے لایا گیا ہے جیسے سورۃ دہر میں سَلَاسِلَا وَاَغْلَالًا (۵۴/ب) میں سلاسلا کا الف، اغلالاً کی مناسبت سے اور یہ عربی قواعد کے عین مطابق ہے۔ سورہ نساء میں ہے وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (۵۵/الف) یہاں ''المقیمین'' کا مدح کی بنا پر منصوب ہونا قواعد کے مطابق ہے۔ سورہ مائدہ میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِـُٔوْنَ..... (۵۵/ب) یہاں ''الصابئون'' کا مرفوع ہونا مبتدا ہونے کی وجہ

سے ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یعنی وَالصَّابِئُوْنَ كَذٰلِكَ ۔ یہ اس بنا پر بھی مرفوع ہوسکتا ہے کہ اس کا عطف اپنے ماقبل فعل ''ھادوا'' کی ضمیر مرفوع پر ہے۔ الغرض یہاں قرآن کریم میں کوئی نحوی اغلاط قطعاً نہیں ہیں جیسا کہ مخالفین قرآن کا دعویٰ ہے اور اس سلسلے کی حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ یا ائمہ کرام کی طرف منسوب بعض روایات قطعاً موضوع اور جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ مشرکین مکہ اور عرب قبائل ان معترضین سے کہیں زیادہ اپنی مادری زبان عربی پر عبور رکھتے تھے۔ اگر ان اعتراضات میں کچھ بھی وزن ہوتا تو وہ مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیتے اور قرآن کریم کی ان نام نہاد اغلاط کا ضرور ڈھنڈورا پیٹتے خصوصاً جب کہ انہیں اس تحدی (چیلنج) کا بھی سامنا تھا کہ قرآن کریم یا اس کی کوئی سی دس سورتوں یا کم از کم ایک سورت ہی کی مثل لا کر دکھاؤ۔

۲۳۔ بعض مستشرقین وغیرہ جہالت، تعصب یا صحیح حقائق کا علم رکھنے کے باوجود محض فریب دہی کے جذبے کے تحت قرآن اور اسلام پر جب اعتراض کرتے ہیں تو وہ اکثر و بیشتر جھوٹی اور ضعیف روایات کا سہارا لیتے ہیں یا قرآن کریم کی آیات اور صحیح احادیث کو ہیرا پھیری اور تکلف و تصنع سے کام لیتے ہوئے غلط معنیٰ پہناتے ہیں۔ یہاں سادہ اور معقول اصول یہ ہے کہ چونکہ کوئی صحیح حدیث قرآن کریم کے مخالف و معارض نہیں ہوسکتی لہٰذا اگر کوئی تعارض نظر آئے تو حدیث کو قرآن کے تابع کرتے ہوئے دونوں میں تطبیق (مطابقت) پیدا کی جائے گی۔ اگر بالفرض ایسی تطبیق ممکن نہ ہو یا صحیح تطبیق کو بھی فریق مخالف قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو کتاب اللہ یعنی قرآن کریم کو ہی لیا جائے گا۔ کیونکہ جس خبر و روایت میں خطا کا معمولی سے معمولی بھی احتمال ہو، وہ یقینی اور قطعی نہیں بلکہ ظنی کہلائے گی اور ظن کے مقابلے میں ترجیح ہمیشہ یقین قطعی کو ہی حاصل ہوگی اور یہ یقین قطعی اوپر سے منتقل ہونے والی صرف متواتر خبروں سے حاصل ہوسکتا ہے۔ قرآن کریم ہم تک طبقاتی تواتر سے پہنچا ہے یعنی رسول اکرم ﷺ کے زمانے سے لے کر ہر دور اور ہر طبقے میں لاتعداد لوگوں نے اسے آگے منتقل کیا ہے درمیان میں کہیں بھی سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔

۲۴۔ لفظ ''ہدایت'' کا معنیٰ جب ایصال الی المقصود یعنی دنیا میں سیدھے راستے پر چلا کر آخرت میں منزل مقصود تک پہنچانے کا ہو تو اس معنیٰ میں صرف اللہ تعالیٰ ہی ہادی ہے۔ ہدایت کا معنیٰ جب انیراۃ الطریق یعنی راستے دکھانے کا ہو تو اسی معنیٰ میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے سچے ورثا یعنی اہل علم ہادی (رہنما) کہلاتے ہیں۔ قرآن کریم میں سیاق و سباق کے اعتبار سے ہدایت کا لفظ مذکورہ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے اور متعلقہ مضامین میں کوئی حقیقی تعارض نہیں ہے۔

۱۰۔تعددِ ازواج:

(الف) تقابلی جائزہ

بائبل کے پرانے عہدنامے کی کتاب تواریخ اول میں ہے''اور داؤد نے یروشلم میں اور عورتیں بیاہ لیں اور اس سے اور بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئے'' (۵۵/ ج) اور کتاب سموئیل دوم میں ہے'' اور حبرون سے چلے آنے کے بعد داؤد نے یروشلم سے اور حرمیں رکھ لیں اور بیویاں کیں اور داؤد کے ہاں بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں'' (۵۶/ الف) اور کتاب سلاطین اول میں ہے''اور اس (سلیمان) کے پاس سات سو شہزادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں اور اس کی بیویوں نے اس کے دل کو پھیر دیا'' (۵۶/ ب) کتابِ پیدائش میں ہے''اور ابرام (ابراہیم) کو ملک کنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اس کی بیوی سارہ نے اپنی مصری لونڈی اسے دی کہ اس کی بیوی بنے'' (۵۶/ ج) اور اسی کتاب پیدائش میں ہے ''اور ابرہام نے پھر ایک اور بیوی کی جس کا نام قطورہ تھا'' (۵۷/ الف)

اور اسی کتاب پیدائش میں ہے''اس وقت یعقوب کے بارہ بیٹے تھے لیاہ کے بیٹے یہ تھے..... اور راخل کے بیٹے یہ تھے..... اور راخل کی لونڈی بلہاہ کے بیٹے دان اور نفتالی تھے اور لیاہ کی لونڈی زِلفہ سے بیٹے جاد اور آشر تھے۔ یہ سب یعقوب کے بیٹے ہیں''۔ (۵۷/ ب) بلہاہ، راخل کی اور زلفہ، لیاہ کی لونڈی تھی۔ حضرت یعقوبؑ کی دونوں بیویوں راخل اور لیاہ نے بہ مطابق کتاب پیدائش اپنی یہ لونڈیاں آپ کے نکاح میں دے دی تھیں (۵۷/ ج) راخل اور لیاہ دونوں خواتین حضرت یعقوبؑ کے ماموں لابن کی بیٹیاں تھیں جن سے حضرت یعقوبؑ نے نکاح کیا تھا (۵۸/ الف) کتابِ استثناء میں ہے''اگر کسی مرد کی دو بیویاں ہوں اور ایک محبوبہ اور دوسری غیر محبوبہ ہو''۔ (۵۸/ ب) کتابِ قضاۃ میں ہے''اور فرعون کے ستر بیٹے تھے جو اس ہی کی صلب سے پیدا ہوئے۔ کیونکہ اس کی بہت سی بیویاں تھیں'' (۵۸/ ج) کتاب تواریخ دوم میں ہے''اور رحبعام (یعنی سلیمانؑ کا بیٹا) ابی سلوم کی بیٹی معکہ کو اپنی سب بیویوں اور حرموں سے زیادہ پیار کرتا تھا (کیونکہ اس کی اٹھارہ بیویاں اور ساٹھ حرمیں تھیں اور اس سے اٹھائیس بیٹے اور ساٹھ بیٹیاں پیدا ہوئیں)''۔ (۵۹/ الف) اور اسی کتاب تواریخ دوم میں ہے''لیکن ابیاہ (یعنی رحبعام کا بیٹا) قوی ہو گیا اور اس نے چودہ بیویاں بیاہیں اور اس سے بائیس بیٹے اور سولہ بیٹیاں پیدا ہوئیں (۵۹/ ب) انجیل متی میں حضرت یسوعؑ نے دس کنواریوں کی تمثیل بیان فرمائی ہے جن میں پانچ عقل مند اور پانچ بے وقوف تھیں۔ پانچ عقل مند تو شادی کے بعد جشن میں دولہا کے ساتھ گھر میں چلی گئیں اور باقی پانچ کے لئے

دروازہ نہ کھولا گیا (۵۹/ ج) اگر ایک سے زائد شادیوں کا ہونا ناجائز ہوتا تو حضرت یسوعؑ ایسی تمثیل ہرگز بیان نہ فرماتے۔ حضرت یسوعؑ نے بہ مطابق اناجیل بیوی کو طلاق دینے کی اجازت صرف اس صورت میں دی جب کہ وہ حرام کار ہو اور فرمایا کہ خاوند اور بیوی دو نہیں بلکہ ایک جسم ہوتے ہیں (۶۰/ الف) ظاہر ہے یہاں خاوند اور بیوی کو ایک جسم قرار دینا مجازی معنی میں ہے ورنہ حقیقی جسم تو دو ہی رہتے ہیں۔ حضرت یسوعؑ بیوی کو طلاق نہ دینے اور زوجین کو باہم ایثار و محبت سے ایک دوسرے کے حقوق کو پورا کرنے کی تلقین فرما رہے ہیں۔ تعدد ازواج (ایک سے زیادہ شادیوں) سے روکنا مقصود نہیں ہے۔ اگر ''الف'' کی دو بیویاں ''ب'' اور ''ج'' ہوں تو جس طرح الف + ب = ایک ہوسکتا ہے تو الف + ج = ایک کیوں نہیں ہوسکتا؟ چنانچہ عیسائی مذہبی پیشوا فادر یوجین ہلمین (Father Eugene Hillman) کا یہ کہنا بالکل بے جا ہے کہ بائبل کے نئے عہد نامے میں کہیں بھی واضح حکم نہیں ملتا کہ شادی صرف ایک ہی خاتون سے ہونی چاہئے اور نہ ہی ایسا کوئی واضح حکم ملتا ہے کہ تعدد ازواج ممنوع ہے (۶۰/ ب) اور مذکورہ فادر کا یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ رومی چرچ نے ایک سے زائد شادیوں پر پابندی یونانی اور رومی ثقافت کے زیر اثر عائد کی تھی جس کے تحت صرف ایک شادی کی اجازت تھی لیکن خواتین سے ناجائز تعلقات استوار کرنے اور داشتائیں رکھنے پر کوئی پابندی نہ تھی (۶۰/ ج) یہودیوں کی تالمود میں بھی بہ یک وقت چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ حضرت یعقوبؑ کی چار بیویاں تھیں (۶۱/ الف) الغرض بائبل سے تعدد ازواج کا بھرپور ثبوت فراہم ہوتا ہے کیونکہ اس سے متعدد معاشرتی مسائل اور پیچیدگیوں کو سلجھانے میں مدد ملتی ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اگر کسی معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں سے بڑھ جاتی ہے تو جنسی بے راہ روی کے سدباب کے لئے تعدد ازواج ناگزیر ہے۔ بعض اوقات ایک خاتون بیمار یا بانجھ ہوتی ہے۔ اسے طلاق دے کر بے سہارا کرنے کی بہ جائے یہی بہتر ہوتا ہے کہ ایک سے زائد شادیوں کی اجازت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

تعدد ازواج کے سلسلے میں قرآن کریم میں ہے کہ اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے انصاف نہ رکھ سکو گے تو اور عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں دو دو یا تین تین یا چار چار عورتوں سے نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو ایک (عورت ہی کافی ہے) یا لونڈی (کافی ہے) جس کے تم مالک ہو، اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔ (۶۱/ ب) جب بائبل اور قرآن کریم دونوں سے ایک سے زائد شادیوں کا جواز ثابت ہے تو اہل کتاب کا اس پر اعتراض کرنا محض جہالت یا ضد اور تعصب پر مبنی ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو بائبل میں تو بیک وقت ایک سے زائد بیویوں کی متعین تعداد معلوم ہی نہیں

ہوتی مثلاً رحبعام بن سلیمانؑ کی اٹھارہ اور ابیاہ بن رحبعام کی چودہ بیویاں تھیں۔ اس کے برعکس قرآن کریم کی رو سے مسلمانوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں چار سے زیادہ عورتیں اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتے اور یہ اجازت بھی صرف انہی لوگوں کے لئے ہے جو بیویوں میں عدل و انصاف کو قائم رکھ سکیں ورنہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کریں۔

(ب) رسول اکرم ﷺ کے متعدد خواتین سے نکاح

شریعت میں کچھ کام بعض لوگوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں مثلاً موسوی شریعت میں کاہن (مذہبی سردار) کا عہدہ صرف حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد کے لئے ہی مخصوص تھا۔ اور کاہنوں کے لئے ایک خاص لباس بھی تجویز کیا گیا تھا جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرے (۶۱/ ج) اسی طرح شریعت محمدیہ ﷺ میں کچھ امور مثلاً بہ یک وقت چار عورتوں سے زائد کو نکاح میں رکھنا وغیرہ رسول اکرم ﷺ کے لئے مخصوص ہیں۔ چنانچہ سورہ احزاب میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اے نبی ہم نے تیرے لئے تیری وہ بیویاں حلال کر دی ہیں جن کے مہر تو نے انہیں ادا کر دیئے ہیں اور جو اللہ نے تجھے (کفار سے بہ طورِ مال غنیمت) دلائی ہیں اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں جو تیرے ساتھ (یعنی تیری طرح) ہجرت کر کے آئی ہیں (سب بہ ذریعہ نکاح حلال ہیں) اور اگر کوئی مومن عورت اپنے تئیں نبی کو بخش دے (یعنی مہر لئے بغیر نکاح میں آنا چاہے) بہ شرطے کہ نبی بھی اس سے نکاح کرنا چاہے (وہ بھی حلال ہے لیکن یہ اجازت اے نبی) خاص تجھ ہی کو ہے۔ سب مسلمانوں کو نہیں۔ ہم نے ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں (جو مہر واجب الادا) مقرر کر دیا ہے ہمیں معلوم ہے۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے تا کہ تجھ پر کسی طرح کی تنگی نہ رہے اور اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے (۶۲/ الف) یہ بھی رسول اکرم ﷺ کی خصوصیات میں ہے کہ آپ کے انتقال کے بعد کسی کو ازواج مطہرات سے نکاح کی اجازت نہیں دی گئی، چنانچہ اسی سورہ احزاب میں صحابہ کرامؓ کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مجلس کے آداب کی تعلیم دینے کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا کہ تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ اس (رسول اللہ ﷺ کی وفات) کے بعد اس کی بیویوں سے تم نکاح کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے (۶۲/ ب) رسول اکرم ﷺ کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ آپ کو ازواج مطہرات کے درمیان باریاں مقرر کرنے میں یہ اختیار دیا گیا کہ آپ جس کی باری چاہیں بحال رکھیں اور جس کی باری چاہیں موقوف فرما دیں، چنانچہ اسی سورہ احزاب میں ہے کہ (اے پیغمبر!) ان (بیویوں میں سے) جسے تو چاہے دور کر دے اور جسے چاہے اپنے پاس رکھ لے اور اگر تو ان

میں سے بھی کسی کو اپنے پاس بلا لے جنہیں تو نے الگ کر رکھا تھا تو (اس پر بھی) تجھ پر کوئی گناہ نہیں۔ اس میں اس بات کی زیادہ توقع ہے کہ ان عورتوں کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غم گین نہ ہوں اور جو کچھ بھی تو انہیں دے دے اس پر وہ سب کی سب راضی رہیں۔ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے، اللہ اسے خوب جانتا ہے اور اللہ علم والا (اور) تحمل والا ہے (۶۲/ ج) اس اجازت کے باوجود رسول اکرم ﷺ نے امت کی رہنمائی کے لئے اپنی دنیوی حیات طیبہ کے آخر تک ہر بیوی کے لئے باری مقرر فرمائی صرف حضرت سودہؓ نے بڑھاپے میں اپنی باری حضرت عائشہ صدیقہ کو بخش دی تھی۔ اپنے مرضِ وفات میں جب آپ کو شدید کم زوری لاحق ہوئی اور تکلیف و درد کی شدت میں تمام ازواج مطہرات کے ہاں باری باری قیام فرمانا آپ کے لئے مشکل ہو گیا تو آپ نے سب ازواج مطہرات کی رضامندی سے آخری ایام میں حضرت عائشہؓ کے حجرے میں قیام فرمایا اور یہیں آپ نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ ازواج مطہرات میں برابری رکھنے کے معاملے میں آپ فرمایا کرتے تھے "یا اللہ! یہ میری تقسیم ہے جو میرے بس میں ہے۔ لیکن جس چیز پر تیرا اختیار ہے اور جس پر میں اختیار نہیں رکھتا اس پر تو مجھے ملامت نہ کر" (۶۳/ الف) اور بائبل کی کتاب خروج کے حوالے سے مذکور ہو چکا ہے کہ شریعت میں کچھ کام بعض لوگوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں جیسے کہانت (بنی اسرائیل میں مذہبی سرداری) کے عہدے اور اس کے مخصوص لباس کا صرف حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد کو مستحق ٹھہرایا گیا تھا لہٰذا رسول اکرم ﷺ کی مذکورہ بالا خصوصیات پر اہل کتاب اعتراض کرنے میں قطعاً حق بہ جانب نہیں ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچیس سال کی عمر میں پہلی شادی ایک بیوہ خاتون حضرت خدیجہؓ بنت خویلد سے کی جو مشہور روایات کے مطابق عمر میں آپ سے کوئی پندرہ برس بڑی یعنی چالیس برس کی تھیں۔ ان کے ہوتے ہوئے آپ نے کوئی اور نکاح نہیں کیا۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے وقت آپ کی عمر پچاس برس اور حضرت خدیجہؓ کی پینسٹھ برس تھی۔ اس کے بعد مکی دور میں نو عمر حضرت عائشہؓ اور ادھیڑ عمر کی ایک بیوہ حضرت سودہؓ سے آپ کا نکاح ہوا۔ حضرت عائشہؓ کی رخصتی مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد مدنی دور میں ہوئی۔ وہ واحد کنواری خاتون ہیں جو آپ کے نکاح میں آئیں۔ آپ کے باقی تمام نکاح بھی بڑھاپے میں مدنی دور میں ہوئے ہجرتِ مدینہ کے وقت آپ کی عمر مبارک ترپن سال تھی۔ اگر (معاذ اللہ) نفسانی خواہشات کو ہی پورا کرنے کے لئے آپ کو شادیوں کا شوق ہوتا تو اسے آپ مکی دور میں سہولت سے پورا فرما سکتے تھے اور آپ کا پہلا نکاح بھی پچیس سال کی عمر تک پہنچنے سے بہت پہلے ہو جاتا۔ مکے میں کنواری اور نو عمر خواتین کی کمی نہ تھی۔ آپ اپنے سے کوئی پندرہ سال بڑی بیوہ خاتون سے شادی نہ فرماتے اور مکی

دور میں طویل عرصے تک صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا نہ فرماتے حالانکہ اس وقت کے عرب معاشرے میں لوگوں میں ایک ہی وقت میں بہت سی بیویوں کو نکاح میں رکھنے کا عام رواج تھا اور بیویوں کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ مدنی دور میں بھی آپ کے لئے کنواری اور نوعمر خواتین کی ہرگز کمی نہ تھی۔ آپ کا تعلق قریش کی ممتاز اور معزز شاخ بنی ہاشم سے تھا لیکن آپ نے کسی ہاشمی خاتون سے نکاح کی بہ جائے دوسرے عرب قبائل کی عورتوں سے نکاح فرمایا تاکہ عرب قبائل میں موجود قبائلی تعصب کو ختم کیا جاسکے اور انہیں ایک دوسرے کے قریب لایا جاسکے۔ عرب قبائل میں باہم سخت نسلی تعصب تھا۔ ہر قبیلہ اپنے کو دوسرے قبائل سے برتر ثابت کرنے کی تگ و دو میں رہتا تھا۔ شعر و شاعری کا بڑا موضوع نسلی اور قبائلی تفاخر تھا۔ مختلف قبائل کی عورتوں سے رسول اللہ ﷺ کے نکاح کی وجہ سے قبائلی عداوتیں ختم ہوئیں۔ مثلاً حضرت ابو سفیان حالتِ کفر میں احد، حمراء الاسد اور احزاب کی جنگوں میں مسلمانوں کے خلاف فوج کشی کر چکے تھے لیکن جب ان کی صاحب زادی حضرت ام حبیبہؓ سے رسول اللہ ﷺ کا نکاح ہوا تو حضرت ابوسفیانؓ مسلمانوں کے خلاف نہ صرف کسی فوج مہم سے باز رہنے پر مجبور ہوئے بلکہ غزوہ فتح مکہ کے موقع پر قریش کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ کفر و شرک کی غلیظ دلدل سے نکل کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ اور مثلاً غزوہ بنی مصطلق کے بعد بنو مصطلق کے سردار حارث کی بیٹی حضرت جویریہؓ سے رسول اللہ ﷺ کا نکاح ہوا تو یہ بنو مصطلق کے پورے قبیلے کے لئے نہایت بابرکت ثابت ہوا۔ صحابہ کرامؓ نے جنگ میں پکڑے گئے ان کے تمام قیدی مردوں اور عورتوں کو فوراً رہا کر دیا کیونکہ اب اس قبیلے سے اللہ کے رسول کا مہری رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ صحابہ کرامؓ کے اس طرزِ عمل سے اس قبیلے پر نہایت مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کی مخالفت چھوڑ دی بلکہ رہزنی اور قزاقی جیسے قبیح جرائم سے دست بردار ہو کر شریفانہ متمدن زندگی اختیار کرنے پر مائل ہوئے۔ اور مثلاً غزوہ خیبر کے بعد حضرت صفیہؓ بنت حی سے رسول اللہ ﷺ کے نکاح نے یہودیوں کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ مسلمانوں سے آئندہ کھلم کھلا عداوت کا اظہار کرتے، کیونکہ عربوں میں مصاہرت (سسرالی رشتے) کو خاص احترام حاصل تھا اور داماد سے جنگ لڑنے کو وہ سخت معیوب سمجھتے تھے۔ اور مثلاً امّ المومنین حضرت ام سلمہؓ کا تعلق قریش کی شاخ بنو مخزوم سے تھا۔ مشہور دشمنِ اسلام ابوجہل کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا اور یہ قبیلہ قریش کے دیگر ذیلی قبائل کی نسبت اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا اور اسلام اور مسلمانوں کا شدید مخالف اور طاقت ور حریف تھا۔ غزوہ احد کے بعد حضرت ام سلمہؓ سے رسول اللہ ﷺ کے نکاح سے اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے حضرت خالدؓ بن ولید جیسے نامور افراد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ غزوہ احد میں خالد بن ولید نے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا تھا

لیکن بعد کی صورتِ حال سے ان میں اسلام کے خلاف عداوت میں پہلے والی شدت وحدت برقرار نہ رہی اور بالآخر دائرۂ اسلام میں داخل ہوکر وہ اسلام کے بہترین جرنیل اور رسول اللہ ﷺ کے معتمد ساتھی ثابت ہوئے اور دربارِ نبوی سے سیف اللہ کے لقب سے سرفراز ہوئے اور مثلاً حضرت میمونہؓ بنت الحارث ہلالیہ کی ایک بہن سردار نجد کے گھر میں تھی۔ ۷ ہجری قمری بہ مطابق ۶۲۹ عیسوی میں عمرۃ القضاء کے بعد رسول اکرم ﷺ نے حضرت میمونہ سے نکاح فرمایا۔ اہل نجد قبل ازیں مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے اور غزوہ احد کے بعد پیش آنے والے بئر معونہ حادثے کے وہی ذمہ دار تھے جس میں ستر کے قریب نہایت نامور اصحابِ رسول کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا تھا۔ حضرت میمونہؓ سے نکاح کے بعد نجدی قبائل کی سابقہ عداوت میں بہ تدریج کمی ہوئی اور بالآخر دیگر قبائل عرب کی طرح وہ بھی حلقہ بہ گوشِ اسلام ہوئے۔ اور مثلاً حضرت عائشہ بنت ابی بکر صدیقؓ اور حضرت حفصہ بنت عمر فاروقؓ سے رسول اکرم ﷺ کے نکاح نے آپ کے اپنے ان دو انتہائی مقرب اصحاب کے ساتھ رشتہ مصاہرت بھی قائم کر دیا۔ آپ کی دو صاحب زادیوں حضرت رقیہؓ اور پھر حضرت ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمان ذوالنورینؓ سے ہوا اور ایک صاحب زادی سیدہ فاطمہؓ کا نکاح آپ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ بن ابی طالب سے ہوا تو یہ صہری روابط ان اصحاب رسول کی عظمت و وقار اور رسول اکرم ﷺ سے ان کے تقرب و محبت پر شاہد عدل ثابت ہوئے کہ رسول اکرم ﷺ کی دنیا سے رحلت کے بعد یہی چاروں حضرات خلافتِ راشدہ علیٰ منہاج النبوۃ کے منصبِ جلیلہ پر بالترتیب فائز ہوئے۔ الغرض رسول اکرم ﷺ کے مختلف عرب قبائل کے ساتھ صہری روابط نے مخالفین کی عداوت کو بہ تدریج ختم کرنے اور اسلام کی نشر و اشاعت میں جو نمایاں کردار ادا کیا وہ کسی صاحبِ نظر سے مخفی نہیں۔

ازواج مطہرات کے ذریعے رسول اکرم ﷺ کی گھریلو زندگی اور متعلقہ معاشرتی امور کا علم مسلمان خواتین کو خصوصاً اور عام مسلمانوں کو عموماً ہوا۔ دین کے تمام شعبوں عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق میں خواتین کی دینی رہنمائی میں ان ازواج مطہرات کا نمایاں کردار ہے۔ خصوصاً حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ وغیرہ امہات المومنین سے مروی رسول اکرم ﷺ کی احادیث سے امت مسلمہ کو بہت سے دینی مسائل میں بصیرت حاصل ہوئی۔ نیز ہر عمر اور ہر مزاج و طبیعت کی خواتین سے نکاح فرما کر رسول اکرم ﷺ نے عائلی امور میں امت کے سامنے بہترین نمونہ رکھا۔ زوجین کی عمروں میں زیادہ تفاوت کی وجہ سے عام حالات میں ایسی شادیاں بے جوڑ سمجھی جاتی ہیں اور عموماً ان سے احتراز کیا جاتا ہے لیکن یہ روزمرہ کا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ بعض غیر معمولی حالات میں ایسی شادیاں کبھی ناگزیر بھی ہو جاتی

ہیں۔ اس طرح کی شادیوں سے پیدا ہونے والے بعض نفسیاتی اور عائلی مسائل اور دیگر متعلقہ امور میں بھی رہنمائی کے لئے رسول اکرم ﷺ نے امت کے سامنے بہترین نمونہ عمل پیش فرمایا۔ پاکیزہ اور پر مسرت ازدواجی زندگی بہت بڑی نعمت ہے۔ کسی بیوہ یا مطلقہ کی بہ جائے کنواری خاتون سے نکاح ازدواجی زندگی کو زیادہ خوش گوار بناتا ہے چنانچہ رسول اکرم ﷺ کو جب اپنے ایک صحابی حضرت جابرؓ کے متعلق معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک بیوہ خاتون سے نکاح کیا ہے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ تو نے کسی کنواری خاتون سے نکاح کیوں نہ کیا وہ تم سے کھیلتی اور تو اس سے کھیلتا (۶۳/ ب) ایک اور موقع پر آپ نے کنواری خواتین سے نکاح کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ تم کنواریوں سے نکاح کیا کرو، ان کے منہ زیادہ شیریں ہوتے ہیں، ان کی اولاد زیادہ ہوتی ہے اور وہ تھوڑی چیز پر بھی قناعت کر لیتی ہیں۔ (۶۳/ ج) دیکھئے کنواری خواتین سے نکاح کی ترغیب کے باوجود خود رسول اکرم ﷺ کا اپنا پہلا نکاح بھی ایک بیوہ معزز خاتون امّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے ہوا جو عمر میں بھی مشہور روایات کے مطابق آپ سے کوئی پندرہ برس بڑی تھیں۔ امّ المومنین حضرت عائشہؓ واحد خاتون ہیں جو سب ازواج مطہرات سے کم عمر اور کنواری تھیں۔ باقی سب ازواج مطہرات بیوہ خواتین تھیں اور حضرت زینبؓ بنت جحش مطلقہ تھیں۔ بیوہ اور مطلقہ خواتین جن معاشی اور معاشرتی مشکلات کا عموماً شکار ہوتی ہیں اور جن نفسیاتی مسائل سے وہ بے چاری دوچار ہوتی ہیں، رحمۃ للعالمین رسول اکرم ﷺ ان سے بے خبر نہ تھے۔ ایسی خواتین سے نکاح کرنے سے ان کے ساتھ معاشرت اور دیگر متعلقہ امور میں جس حکیمانہ اور محتاط طرزِ عمل کی ضرورت ہے، رسول اکرم ﷺ نے اپنے اسوۂ حسنہ سے اس سلسلے میں بھی امت محمدیہ کی رہنمائی فرمائی۔ الغرض آپ کا مختلف عمر اور مختلف قبائل کی متعدد خواتین کو اپنے نکاح میں لانا لاتعداد دینی و دنیوی مصلحتوں اور فوائد پر مشتمل تھا۔ ورنہ پیٹ اور پیڑو کے پجاری حلال و حرام کی تمام حدود کو پھلانگ جاتے ہیں۔ انہیں اکثر و بیشتر گھر بسانے اور کسی کا سہارا بننے کی بہ جائے محض اپنی شہوانی اغراض کی تکمیل ہی مقصود ہوتی ہے اور اس کے لئے وہ مواقع اور وسائل کو ہرگز ضائع نہیں کرتے۔ رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحابؓ کی زندگی اس طرح کی آلائشوں سے پاک ہے چنانچہ ازواج مطہرات کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی معاشرت نہایت ذمے دارانہ، باوقار اور شریفانہ تھی۔ آپ کی تربیت کے زیرِ اثر وہ خود بھی صبر و قناعت، تواضع و خدمت، اطاعت و اتباع اور ایثار و محبت کا بہترین نمونہ تھیں۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ مجھے علم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی میدے کی نرم روٹی کھائی ہو یہاں تک آپ اللہ سے جا ملے اور نہ ہی کبھی آپ نے اپنی آنکھ سے بھنی ہوئی بکری دیکھی (۶۴/ الف) امّ المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کبھی دو دو ماہ

گزر جاتے اور تیسرے مہینے کا چاند نظر آجاتا لیکن رسول اللہ ﷺ کے گھر میں آگ نہ جلتی۔ حضرت عروہؒ کے دریافت کرنے پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ہماری گزر بسر اکثر و بیشتر کھجور اور پانی پر ہی ہوا کرتی تھی (۶۴/ ب) اس روکھی پھیکی زندگی اور تنگی وترشی کی حالت میں دن گزرتے رہے۔ جب غزوہ خیبر وغیرہ میں اموالِ غنیمت بکثرت حاصل ہوئے تو ازواج مطہرات نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا کہ معاشی اعتبار سے ان کی گھریلو زندگی میں بھی فراوانی کے کچھ آثار نظر آنے چاہئیں۔ لیکن قرآن کریم میں آیتِ تخییر نازل ہوئی کہ اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں عمدہ ساز وسامان دے کر خوش اسلوبی سے رخصت کردوں اور اگر تم اللہ، اس کے رسول اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہو تو بے شک اللہ نے تم میں سے نیک خواتین کے لئے بہترین (اخروی) اجر تیار کر رکھا ہے (۶۴/ ج) ان آیات کے نزول پر فرماں بردار اور سعادت منداز واج مطہرات نے دنیوی ٹھاٹھ باٹھ کی پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے اللہ، اس کے رسول اور اخروی اجر کو اپنے لئے اختیار فرمایا۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی خانگی زندگی میں جہاں بہت سی ضرورت مند بیوہ خواتین کو سہارا دیا وہاں خوراک ولباس کے معاملے میں دنیوی عیش وعشرت پر آخرت کو ترجیح دینے اور روکھی پھیکی زندگی میں صبر وقناعت سے کام لے کر اطمینان وسکون تلاش کرنے اور ہر حال میں اللہ اور رسول کی رضا کے لئے کام کرنے کی نہایت عمدہ تلقین بھی امت کے فقراء اور مساکین کو عملی طور پر فرمائی۔ رات کو تہجد کی نماز میں آپ کا قیام نہایت طویل ہوتا تھا کہ بعض اوقات پاؤں متورّم ہوجاتے ان حالات میں عیش وعشرت کا تصور کہاں تھا؟

(ج) رسول اکرم ﷺ کی عائلی زندگی پر متعصب مستشرقین کے بعض لغو اعتراضات کا تعاقب

بعض متعصب شرق شناسوں نے امّ المومنین حضرت زینبؓ بنت جحش سے رسول اکرم ﷺ کے نکاح کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ ان کا آپ پر اعتراض ہے کہ آپ ایک مرتبہ اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ کے گھر میں داخل ہوئے۔ پردہ ہٹانے پر آپ کی نظر اچانک ان کی بیوی زینبؓ بنت جحش پر پڑی اور آپ (معاذ اللہ) ان پر فریفتہ ہوگئے۔ حضرت زیدؓ کو معلوم ہوا تو انہوں نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی اور آپ نے ان سے شادی کرلی۔ امّ المومنین حضرت زینبؓ بنت جحش رسول اکرم ﷺ کی پھوپھی زاد تھیں۔ آپ ہی کی تجویز پر ان کا پہلا نکاح آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ سے ہوا تھا۔ حضرت زیدؓ کو آپ نے متبنّیٰ (منہ بولا بیٹا یا لے پالک) بنا رکھا تھا اور لوگ انہیں زید بن حارثہ کے بجائے

زید بن محمد کہا کرتے تھے، کیونکہ دور جاہلیت کا یہی دستور تھا اور اس دور کی غلط رسوم کے مطابق لے پالک کو حقیقی بیٹے کی طرح سمجھا جاتا تھا اور متبنّیٰ (لے پالک) بنانے والے کے لئے اپنے متبنّیٰ کی بیوی سے نکاح ایسے ہی (ناحق) حرام سمجھا جاتا تھا جیسے حقیقی بہو سے نکاح حرام ہوتا ہے۔ حضرت زینبؓ کا تعلق معزز قریشی خاندان سے تھا جب کہ حضرت زید آپ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ اور دیگر وجوہات کی بنا پر آپس میں دونوں کا نباہ نہ ہوسکا جس پر حضرت زیدؓ نے انہیں طلاق دینے کا ارادہ کیا رسول اکرم ﷺ نے حضرت زیدؓ کو صبر و تحمل سے کام لینے، اللہ سے ڈرنے اور طلاق نہ دینے کا مشورہ دیا لیکن حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کی باہم سرد مہری اور بے رخی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ حضرت زیدؓ کو بالآخر مجبوراً طلاق دینی پڑی۔ متبنّیٰ کی بیوی سے نکاح کو حرام سمجھنے کی غلط رسم کے استیصال اور حضرت زینبؓ کی دل جوئی کے لئے یہ انتہائی مناسب بلکہ ضروری تھا کہ حضرت زینبؓ کا نکاح رسول اکرم ﷺ سے ہو، کیونکہ حضرت زینبؓ نے نہ چاہتے ہوئے بھی صرف رسول اکرم ﷺ کی خواہش کے احترام میں حضرت زیدؓ سے نکاح پر رضامندی ظاہر کی تھی لیکن بعد کے حالات نے ثابت کر دیا تھا کہ یہ نکاح برقرار نہیں رہ سکتا اور بالآخر انہیں طلاق ہوگئی۔ حضرت زینبؓ کو رسول اکرم ﷺ ان کے بچپن سے ہی خوب جانتے پہچانتے تھے۔ وہ آپ کی پھوپی زاد تھیں اگر آپ بعض (موضوع اور جھوٹی) روایات کے تحت ان پر فریفتہ ہوتے تو ابتدا ہی سے انہیں اپنے نکاح میں لاتے جب کہ وہ نوعمر اور کنواری بھی تھیں۔ اس صورت میں خود حضرت زینبؓ اور ان کے گھرانے کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ سے ان کا نکاح آپ ہی کی ترغیب سے ہوا تھا۔ اب جو نئی صورت حال پیدا ہوئی تو اس میں آپ کو بجا طور پر خدشہ لاحق تھا کہ حضرت زینبؓ سے آپ کے نکاح کی صورت میں دشمنوں اور مخالفوں کو اس طرح کی چہ میگوئیاں کرنے کا خوب موقع ہاتھ آئے گا کہ محمد (ﷺ) اپنی بہو کو اپنے نکاح میں لے آئے ہیں۔ آپ کی اس طبعی ہچکچاہٹ پر اللہ تعالیٰ نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا کہ (وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب تو اس شخص (زید بن حارثہ) سے جس پر اللہ نے احسان کیا تھا اور تو نے بھی احسان کیا، کہتا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھ اور اللہ سے ڈر اور تو اپنے دل میں وہ بات پوشیدہ رکھتا تھا جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور (بظاہر) تو لوگوں سے ڈرتا تھا حالانکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تو اس سے ڈرے (اور بہ ظاہر ایسا رویہ اختیار نہ کرے جس سے لوگ یہ غلط سمجھیں کہ تو اللہ کی بہ جائے لوگوں سے ڈرتا ہے) پھر جب زید نے اس سے (کوئی) حاجت متعلق نہ رکھی (یعنی طلاق دے دی) تو ہم نے اس کا نکاح تجھ سے کر دیا تاکہ مومنوں کے لئے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (کے ساتھ نکاح کرنے

کے) بارے میں جب وہ ان سے اپنی حاجت (متعلق) نہ رکھیں (یعنی انہیں طلاق دے دیں) کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ کا حکم تو واقع ہو کر رہنے والا تھا (۶۵/ الف) اس آیت میں رسول اکرم ﷺ کو جہاں بشارت آمیز لہجے میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تو وہیں آپ کو اور حضرت زینبؓ دونوں کو بشارت بھی سنا دی کہ اللہ نے حضرت زینبؓ کا نکاح خود ہی آپ سے کر دیا ہے۔ حضرت زینبؓ کو عمر بھر اپنی اس خصوصیت پر فخر رہا کہ ان کا نکاح تو خود اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ سے کر دیا۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ رسول اکرم ﷺ کے اصحاب میں سے وہ واحد صحابی رسول ہیں جن کا نام اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر فرما دیا۔ اس تمام وضاحت سے معلوم ہوا کہ رسول اکرم ﷺ کا بڑا مقصد یہ تھا کہ ایک شرعی حکم کو اپنے عمل سے لوگوں پر واضح کریں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زینبؓ کا نکاح آپ سے کر دیا۔ اور یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس (اللہ) نے تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے نہیں بنایا، یہ سب تمہارے منہ کی باتیں ہیں اور اللہ تو سچی بات کہتا ہے اور وہی سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ تم ان (لے پالکوں) کو ان کے (اصلی) باپوں کے نام سے پکارا کرو کہ اللہ کے نزدیک یہی بات درست ہے۔ اگر تم کو ان کے باپوں کے نام معلوم نہ ہوں تو وہ دین میں تمہارے بھائی اور دوست ہیں، اور جو بات (اس سے پہلے) تم سے غلطی سے ہوگئی ہو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، لیکن جو دلی ارادے سے کرو گے (اس پر مؤاخذہ ہو سکتا ہے) اور اللہ نہایت بخشنے والا (اور) بہت مہربان ہے (۶۵/ ب) امّ المومنین حضرت زینبؓ بنت جحش کے سلسلے میں تفسیر بیضاوی میں جو روایت منقول ہے وہ اہلِ علم کے نزدیک موضوع اور نا قابل قبول ہے، کیونکہ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے حضرت زینبؓ رسول اکرم ﷺ کی پھوپی زاد تھیں اور آپ کے لئے ہر گز اجنبی نہ تھیں کہ یک دم آپ کی نظر ان پر پڑتی اور آپ (معاذ اللہ) ان پر فریفتہ ہو جاتے۔ آپ کو ان پر (معاذ اللہ) ایسے ہی فریفتہ ہونا ہوتا تو آپ ابتدا ہی سے انہیں اپنے نکاح میں لے آتے جب کہ وہ نوعمر اور کنواری تھیں حضرت زینبؓ اور ان کا خاندان بھی اس پر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ آپ ہرگز ایسا نہ کرتے کہ حضرت زینبؓ اور ان کے خاندان کی ہچکچاہٹ کے باوجود حضرت زینبؓ کا پہلا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے کرتے اور پھر ایک مدت کے بعد ان سے طلاق دلا کر خود حضرت زینبؓ سے نکاح کی (معاذ اللہ) منصوبہ بندی کرتے۔ خوب غور کیجئے ایسا لمبا اور پُر خطر راستہ اختیار کرنے کی آپ کو ضرورت ہی کیا تھی؟ آپ شروع ہی سے انہیں اپنے نکاح میں کیوں نہ لے آئے؟ الغرض اللہ تعالیٰ کے علم اور ارادے کے عین مطابق ایسے حالات ضرور پیدا ہونے ہی تھے جن سے لے پالک بیٹوں کی بیویوں سے لے پالک (متبنّیٰ) بنانے والوں کے نکاح کے حرام اور معیوب ہونے کے جاہلی تصور کی بہ خوبی اصلاح ہو سکے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بارے میں بھی متعصب اہل کتاب کا اعتراض ہے ہے کہ حضرت ماریہ قبطیہؓ کو ام المومنین حضرت حفصہؓ نے اپنے مکان میں اپنی باری کے دن رسول اکرم ﷺ کے ساتھ خلوت میں دیکھ لیا جس پر وہ سخت رنجیدہ ہوئیں۔ اس پر آپ نے حضرت حفصہؓ کی خوش نودی کے لئے ماریہ قبطیہؓ کو اپنے اوپر حرام کرلیا مگر آپ تحریم پر قائم نہ رہے۔ سورہ تحریم کی ابتدائی آیات کے شانِ نزول کے متعلق صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ اپنی اہلیہ ام المومنین حضرت زینبؓ بنت جحش کے ہاں کچھ زیادہ دیر ٹھہرتے اور وہاں شہد نوش فرماتے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ چونکہ حضرت زینبؓ کی سوکنیں تھیں اس لئے رسول اکرم ﷺ کو حضرت زینبؓ کے ہاں زیادہ دیر تک ٹھہرنے سے روکنے کے لئے طے شدہ منصوبے کے تحت انہوں نے آپ سے کہا کہ آپ کے منہ سے مغافیر (ایک قسم کا پھول جس کی بو قدرے ناگوار ہوتی ہے) کی بو آرہی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے زینبؓ کے ہاں شہد پیا تھا (ممکن ہے بواسی وجہ سے ہو) اور قسم کھائی کہ آئندہ میں شہد نہیں پیا کروں گا (۶۵/ ج) سنن نسائی کی روایت کے مطابق آپ نے اپنے اوپر ایک لونڈی کو حرام کرلیا تھا اس کی وضاحت دوسری کتابوں میں یوں ہے کہ یہ حضرت ماریہ قبطیہؓ تھیں جن سے رسول اکرم ﷺ کے صاحب زادے حضرت ابراہیمؓ پیدا ہوئے تھے۔ یہ ایک مرتبہ حضرت حفصہؓ کے گھر آگئی تھیں۔ جب کہ حضرت حفصہؓ گھر میں موجود نہیں تھیں ابھی یہ گھر ہی میں تھیں کہ حضرت حفصہؓ بھی آگئیں انہیں اپنے گھر میں حضرت ماریہؓ کا رسول اکرم ﷺ کے ساتھ خلوت میں ہونا ناگوار گزرا۔ حضرت حفصہؓ کو راضی کرنے کے لئے آپ نے قسم کھالی۔ ممکن ہے سورہ تحریم کی ابتدائی آیات کا شان نزول یہ دونوں واقعات ہوں (۶۶/ الف) اللہ تعالیٰ نے سورہ تحریم کی ابتدائی آیات میں آپ کو تنبیہ فرمائی اور قسم کا کفارہ ادا کرنے کا طریقہ یاد دلایا تاکہ جس کام کے نہ کرنے کی آپ نے قسم کھائی تھی، اس کا کرنا آپ کے لئے حلال ہوجائے۔ قسم کے کفارے کا طریقہ سورہ مائدہ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ (اے مسلمانو!) اللہ تعالیٰ تمہاری بے ہودہ (یعنی بے ارادہ) قسموں پر تم سے مؤاخذہ نہیں کرے گا لیکن پختہ قسموں پر (جن کے خلاف تم کرو گے) مؤاخذہ کرے گا تو (ایسی قسم) کا کفارہ دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا ہے اور جس کو یہ میسر نہ ہو وہ تین روزے رکھے، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھاؤ (اور اسے توڑ دو) اور تمہیں چاہئے کہ اپنی قسموں کی حفاظت کرو، اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیتوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر کرو (۶۶/ ب) چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر آپ نے قسم کا کفارہ ادا فرمایا۔ یوں آپ نے اپنا سابقہ فیصلہ اللہ کے حکم سے کفارہ ادا کرکے بدلا جس پر

دونوں کو خوب جانتے پہچانتے تھے۔ یہی کہا جاسکتا ہے کہ بہ مطابق بائبل آپ راخل کی محبت میں (معاذ اللہ) اس قدر از خود رفتہ اور مغلوب الحال ہو چکے تھے کہ اپنے ماموں اور خسر لابن کے فریب میں بڑی آسانی سے آگئے۔ اگلی صبح آپ نے لابن سے شکایت کی تو اس نے کہا کہ راخل کی خاطر تجھے مزید سات سال میری خدمت کرنا ہوگی۔ چنانچہ راخل کی محبت سے مجبور ہو کر آپ نے مزید سات سال پورے کئے، پھر راخل سے بھی آپ کا نکاح ہو گیا۔ لیاہ اور راخل کی لونڈیاں زلفہ اور بلہاہ بھی آپ کو مل گئیں جن سے بعد میں آپ نے لیاہ اور راخل کے کہنے پر نکاح کر لیا تھا (۴۷/ج)

بہ مطابق بائبل لابن اس قدر لالچی اور خود غرض تھا کہ وہ مقررہ مدت پوری ہونے پر بھی حضرت یعقوبؑ سے ناحق خدمت لیتا رہا۔ اس پر حضرت یعقوبؑ اپنی دونوں بیویوں اور ان کی لونڈیوں کے ہمراہ اس وقت چپکے سے لابن کے گھر سے نکل آئے جب وہ اپنی بھیڑوں کی پشم کترنے گیا ہوا تھا۔ راخل (معاذ اللہ) اپنے باپ کے بتوں کو چرا لائی تھی۔ لابن کو گھر پہنچنے پر ساری صورت حال کا علم ہوا تو اس نے کوہ جلعاد پر حضرت یعقوبؑ کو جا پکڑا اور اس نے کہا کہ تم میری اجازت کے بغیر میرے گھر سے چل دیئے لیکن تو میرے بتوں کو کیوں چُرا لایا ہے؟ حضرت یعقوبؑ نے لابن کو سامان کی تلاشی کی اجازت دے دی۔ راخل نے یہ بت اپنے اونٹ کے کجاوے میں چھپا رکھے تھے اور خود ان پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اپنے باپ لابن سے معذرت کی کہ چونکہ میں ایسے حال میں ہوں جو عورتوں کو ہوا کرتا ہے اس لئے میں یہاں سے اٹھ نہیں سکتی۔ یوں لابن کو وہ بُت نہ مل سکے (۶۸/ الف) یعنی بہ مطابق بائبل حضرت یعقوبؑ اپنی جس محبوبہ پر اس قدر (معاذ اللہ) فریفتہ تھے۔ وہ (معاذ اللہ) بت پرست، چور اور جھوٹی نکلی۔ حضرت یعقوبؑ اور راخل کے خلاف بائبل کے مذکورہ فحش، لچر اور غلیظ مضامین اگر (معاذ اللہ) سچے ہیں تو اگر یہ جھوٹی بات بالفرض تسلیم بھی کر لی جائے کہ رسول اکرم ﷺ (معاذ اللہ) حضرت زینبؓ پر فریفتہ ہو گئے تھے یہ تو سب ہی کو ماننا ہوگا کہ آپ نے کبھی بھی کسی غیر محرم خاتون کو برسر بازار نہیں چوما۔ کسی بھی خاتون کی محبت میں مغلوب ہو کر اپنے کسی بھی خسر کی چودہ سال تک تو کیا ایک دن بلکہ ایک گھنٹے کے لئے بھی بکریاں نہیں چرائیں اور نہ آپ کے کسی خُسر نے آپ کو اپنی بیٹیوں کے بارے میں فریب دیا۔ آپ کی کوئی ایسی محبوبہ نہ تھی جو بت پرست، چور اور جھوٹ بولنے والی ثابت ہوئی ہو۔ اگر ان غلیظ مضامین سے حضرت یعقوبؑ کا مرتبہ اور ان کا منصبِ نبوت اہلِ کتاب کے نزدیک داغ دار نہیں ہوا تو رسول اکرم ﷺ نے تو ایسا کوئی کام بھی نہیں کیا۔ ان حالات میں اہلِ کتاب عورتوں کے بارے میں آپ کے خلاف زبانِ طعن دراز کرتے ہوئے شرم وحیا کو کیوں ملحوظ نہیں رکھتے؟ اگر بائبل کے یہ خبیث مضامین جھوٹے ہیں اور ہم اہل

اسلام کے نزدیک یقیناً جھوٹے ہیں تو جو لوگ اپنے ہی بزرگوں حتیٰ کہ پیغمبروں تک پر بے حیائی اور ڈھٹائی سے بہتان تراشی کرتے ہوں، ان سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ پر بہتان تراشی سے باز رہیں گے؟ حضرت یعقوبؑ کے متعلق کتاب پیدائش میں اس طرح کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ ''خدا اسے پھر دکھائی دیا اور خدا نے اس سے کہا کہ تیرا نام یعقوب ہے، تیرا نام آگے کو یعقوب نہ کہلائے گا بلکہ تیرا نام اسرائیل ہوگا۔ سو اس نے اس کا نام اسرائیل رکھا پھر خدا نے اس سے کہا کہ میں خدائے قادر مطلق ہوں تو برومند ہو اور بہت ہو جا، تجھ سے ایک قوم بلکہ قوموں کے جتھے پیدا ہوں گے اور بادشاہ تیری صلب سے نکلیں گے''۔ (۶۸/ب)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یعقوبؑ خدا کے انتہائی مقرب بندوں میں شامل ہیں۔ خواتین کے سلسلے میں ان کے متعلق بائبل کے مضامین سراسر جھوٹے ہیں۔ کیا اہل اسلام کے حق پر ہونے کا ایک نمایاں ثبوت یہ بھی نہیں ہے کہ ہم مسلمان صرف خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی عزت و آبرو اور ناموس کی حفاظت نہیں کرتے بلکہ اسرائیلی انبیاء علیہم السلام کی عزت و آبرو پر حملہ کرنے والے اہل کتاب کے غلیظ بہتانوں سے ان کی حفاظت اور ان کے خلاف شرمناک الزامات سے ان کی مدافعت بھی ہمارے ہی حصے میں آئی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر ہم اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیْ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ (۶۸/ج)

اللہ کے لئے سب تعریف ہے جس نے ہمیں (اس کام) کی ہدایت نصیب فرمائی اور ہم سیدھی راہ نہ پاسکتے تھے اگر اللہ ہمیں اس کی ہدایت نہ فرماتا۔

الغرض اسرائیلی انبیاء علیہم السلام کے احترام کی سعادت بھی صرف اور صرف اہل اسلام کے حصے میں آئی ہے۔ بہ مطابق بائبل حضرت داؤدؑ نے اپنے شاہی محل کی چھت پر چڑھ کر اوریاہ کی نہایت خوب صورت بیوی بت سبع کو نہاتے دیکھا تو اس پر (معاذ اللہ) اس قدر فریفتہ ہوئے کہ اپنے کچھ آدمی بھیج کر اسے پکڑوالیا اور (معاذ اللہ) اس سے زنا کیا جس سے وہ حاملہ ہوگئی۔ اس پر آپ نے اس کے خاوند اوریاہ کو محاذِ جنگ سے واپس بلالیا تاکہ وہ اپنی بیوی کے پاس جائے اور بت سبع کا حمل اسی کی طرف منسوب ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے بہ مطابق بائبل آپ نے اسے شراب بھی پلائی۔ ناکامی پر اسے پھر میدانِ جنگ میں بھیج کر حیلے سے قتل کروادیا۔ جب اس کی بیوی بت سبع کے ماتم کے دن پورے ہوئے تو حضرت داؤدؑ نے اپنی اس محبوبہ سے شادی کرلی (۶۸/د) حضرت داؤدؑ نے ساؤل بادشاہ کی بیٹی میکل سے بھی نکاح کیا تھا۔ ساؤل نے اس کے مہر میں فلستیوں کے سو آلاتِ تناسل کے ختنے کی کھلڑیاں طلب کی

تھیں اس سلسلے میں کتاب سموئیل اول میں ہے۔ ''اور ہنوز دن پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ داؤد اٹھا اور اپنے لوگوں کو لے کر گیا اور دوسو فلستی (یعنی فلسطینی) قتل کر ڈالے اور داؤد ان کی کھلڑیاں (Foreskins) لایا اور انہوں نے ان کی پوری تعداد میں بادشاہ کو دیا تا کہ وہ بادشاہ کا داماد ہو اور ساؤل نے اپنی بیٹی میکل اسے بیاہ دی''۔ (۶۹/ الف)

اس کے بعد جب حضرت داؤدؑ اور ساؤل میں باہم مزاحمت اور کشمکش کا طویل سلسلہ چلا تو ساؤل نے اپنی اس بیٹی اور حضرت داؤدؑ کی بیوی میکل کو ایک اور شخص فلطی ایل بن لیس کے حوالے کر دیا۔ جب ساؤل مارا گیا تو حضرت داؤدؑ نے اس کے بیٹے اشبوست سے اپنی بیوی میکل کا مطالبہ کیا کہ میری بیوی واپس کرو جس کا مہر میں نے فلستیوں کے دوسو آلات تناسل کی کھلڑیاں پیش کر کے ادا کیا تھا۔ اشبوست نے حضرت داؤدؑ کی اس فریفتگی سے مجبور ہو کر کچھ لوگ بھیجے جو فلطی ایل سے میکل کو چھین لائے اور فلطی ایل شدتِ غم سے پیچھے دور تک روتا چلا آیا (۶۹/ ب) اہل کتاب لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے حضرت داؤدؑ کو عموماً ''کنگ داؤد'' کہتے ہیں اور ان کی نبوت کا انکار کرتے ہیں لیکن بائبل ہی سے اہل کتاب جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ کتاب سموئیل اول میں ہے۔ ''تب سموئیل نے تیل کا سینگ لیا اور اسے (یعنی داؤد کو) اس کے بھائیوں کے درمیان مسح کیا اور خداوند کی روح اس دن سے آگے کو داؤد پر زور سے نازل ہوتی رہی'' (۶۹/ ج) کتاب سلاطین اول میں ہے۔ ''سلیمان نے کہا تو نے اپنے خادم میرے باپ داؤد پر بڑا احسان کیا اس لئے کہ وہ تیرے حضور راستی اور صداقت اور تیرے ساتھ سیدھے دل سے چلتا رہا'' (۷۰/ الف) اور کتاب سموئیل دوم میں ہے۔ ''داؤد بن یسی کہتا ہے یعنی یہ اس شخص کا کلام ہے جو سرفراز کیا گیا اور یعقوب کے خدا کا مسوح ہے اور اسرائیل کا شیریں نغمہ ساز ہے خدا کی روح نے میری معرفت کلام کیا اور اس کا سخن میری زبان پر تھا''۔ (۷۰/ ب)

نئے عہد نامے کی کتاب اعمال میں پطرس حواری کا قول ہے۔ ''اے بھائیو! میں قوم کے بزرگ داؤد کے حق میں تم سے دلیری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ مرا اور دفن بھی ہوا اور اس کی قبر آج تک ہم میں موجود ہے۔ پس نبی ہو کر اور یہ جان کر کہ خدا نے مجھ سے قسم کھائی ہے کہ تیری نسل سے ایک شخص کو تیرے تخت پر بٹھاؤں گا اس نے پیشین گوئی کے طور پر مسیح کے جی اٹھنے کا ذکر کیا.....'' (۷۰/ ج) پولس عبرانیوں کے نام خط میں لکھتا ہے اتنی فرصت کہاں کہ جدعون اور برق اور سمسون اور افتاہ اور داؤد اور سموئیل اور اور نبیوں کے احوال بیان کروں''۔ (۷۱/ الف)

مذکورہ مضامین سے حضرت داؤد کا نبی ہونا بہ خوبی واضح ہے۔ اب اگر حضرت داؤدؑ پر لگائے گئے

مذکورہ نہایت ہی قبیح اور شرم ناک الزامات (معاذ اللہ) درست ہوں تو حضرت زینبؓ اور حضرت ماریہ قبطیہؓ کے سلسلے میں رسول اکرم ﷺ پر اہل کتاب کو اعتراض کرتے ہوئے کچھ تو حیا اور شرم سے کام لینا چاہئے تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے کبھی کسی ہمسائے کے گھر میں جھانک کر کسی عورت کو نہیں دیکھا، کسی عورت سے زنا نہیں کیا، کسی بھی عورت پر فریفتہ ہو کر اس کے خاوند کو قتل نہیں کرایا، کسی کو آپ نے کبھی شراب نہیں پلائی، کسی بھی عورت کے دام محبت کا اسیر ہو کر آپ نے اپنے کسی خسر کو لوگوں کے آلات تناسل کی کھلونا یاں مہر میں پیش نہیں کیں، آپ کی کوئی بیوی آپ سے نکاح کے بعد کسی اور کے گھر میں کبھی آباد نہیں ہوئی کہ آپ کو اس سے ایسی بیوی دوبارہ چھیننی پڑی ہو۔ اگر حضرت داؤدؑ پر اہل کتاب کی یہ بہتان تراشی ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے تو جو لوگ اپنے ہی اسرائیلی بزرگوں اور نبیوں کی سخت ترین توہین و تذلیل سے ذرا بھی نہ شرماتے ہوں، ان سے رسول اکرم ﷺ کے حق میں کسی بھلائی کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ حضرت داؤدؑ کے متعلق بائبل کی کتاب زبور میں ہے ''خداوند نے مجھ (داؤد) سے کہا تو میرا بیٹا ہے آج تو مجھ سے پیدا ہوا'' (۷/ب) اور شاہ یوسیاہ کے متعلق کتاب سلاطین دوم میں ہے۔ ''اس نے وہ کام کیا جو خداوند کی نگاہ میں ٹھیک تھا اور اپنے باپ داؤد کی سب راہوں پر چلا اور داہنے یا بائیں ہاتھ کو مطلق نہ لڑا'' (۷/ج)

اور قبل ازیں حضرت داؤد کے حق میں ان کے صاحب زادے حضرت سلیمانؑ کا قول بھی مذکور ہو چکا ہے کہ حضرت داؤدؑ خدا کے حضور راستی اور صداقت اور خدا کے ساتھ سیدھے دل سے چلتے رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت داؤد کے سب ہی کام خدا کے نزدیک پسندیدہ تھے۔ پس خواتین کے بارے میں حضرت داؤدؑ کے خلاف بائبل میں موجود مواد شرم ناک جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اہل کتاب اس سے بھی شرمندہ نہیں ہوتے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جیسے ان کے اپنے بزرگوں کی عزت و ناموس کی حفاظت ہم مسلمان کر رہے ہیں جب کہ اہل کتاب ان پر فحش بہتان اور شرم ناک جھوٹ باندھتے ہیں۔ اور ایسے لچر مضامین کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) مقدس اور الہامی قرار دے رہے ہیں۔ اہل کتاب نے حضرت داؤدؑ کے جلیل القدر فرزند ارجمند حضرت سلیمانؑ پر بھی فحاشی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر غیر معبودوں کی عبادت کرنے اور ان کے لئے بت خانے تعمیر کروانے کے نہایت ہی سنگین الزامات عائد کر رکھے ہیں۔ مثلاً بہ مطابق کتاب سلاطین اول خدا کے منع کرنے کے باوجود وہ اپنی آخری عمر میں فرعون کی بیٹی اور دوسری لاتعداد اجنبی عورتوں سے (معاذ اللہ) عشق کا دم بھرنے لگے۔ آپ کی سات سو بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں۔ ان کی محبت میں بہ مطابق بائبل آپ (معاذ اللہ) اس قدر مغلوب ہوئے کہ ان کی وجہ سے آپ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) غیر معبودوں کی طرف مائل ہو گئے اور ان کی خاطر آپ نے بڑے بڑے بت خانے تعمیر کروائے،

یعنی آپ ان بیویوں کی محبت میں آخر عمر میں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) مرتد ہو گئے۔ حضرت سلیمانؑ کا نبی ہونا بھی بائبل سے ثابت ہے۔ چنانچہ کتاب سلاطین اول میں ہے کہ آپ کو جبعون کے مقام پر خواب میں خدا نظر آیا تھا اور اس نے آپ کو یہ بشارت سنائی تھی۔ ''میں نے ایک عاقل اور سمجھنے والا دل تجھ کو بخشا، ایسا کہ تیری مانند نہ تو کوئی تجھ سے پہلے ہوا اور نہ کوئی تیرے بعد تجھ سا کوئی برپا ہوگا''۔ (۲/۷ الف)

اور اسی کتاب میں ہے۔ ''اور خداوند کا کلام سلیمان پر نازل ہوا کہ یہ گھر جو تو بناتا ہے سو اگر تو میرے آئین پر چلے اور میرے حکموں کو پورا کرے اور میرے فرمانوں کو مان کر ان پر عمل کرے تو میں اپنا وہ قول جو میں نے تیرے باپ داؤدؑ سے کیا تیرے ساتھ قائم رکھوں گا''۔ (۲/۷ ب)

سلیمانؑ کی کتاب امثال بائبل کا حصہ ہے اور یہ کتب اہلِ کتاب کے ہاں الہامی ہیں۔ اب اگر حضرت سلیمانؑ کے خلاف بائبل کے غلیظ مضامین (معاذ اللہ) سچے ہیں تو اہلِ کتاب کس منہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ طعنہ زنی کرتے ہیں؟ اگر یہ مضامین جھوٹے ہیں اور یقیناً جھوٹے ہیں تو اہل کتاب رسول اکرم ﷺ کے خلاف جھوٹ اور بہتان سے کیوں پرہیز کریں گے؟ جب بائبل میں یہ مضمون بھی موجود ہے کہ خدا نے حضرت سلیمانؑ کو ایسا عاقل اور سمجھنے والا دل بخشا تھا کہ بنی اسرائیل میں ان کی مانند نہ پہلے کبھی کوئی ہوا اور نہ بعد میں برپا ہوا تو صاف معلوم ہوا کہ خواتین کے سلسلے میں اور دیگر باتوں میں حضرت سلیمانؑ کے خلاف بدترین بہتان تراشی کی گئی ہے۔

بہ مطابق اناجیل مریم مگدلینی ایک بدچلن اور فاحشہ عورت تھی اس نے ایک موقع پر حضرت یسوعؑ کے پاؤں چومنا شروع کر دیئے اور اپنے آنسوؤں سے انہیں بھگو ڈالا۔ پھر اس نے اپنے سر کے بالوں سے انہیں پونچھا۔ اس کے بعد ان پر ایک قیمتی عطر ڈالا (۲/۷ ج) اسی مریم مگدلینی کے متعلق انجیل یوحنا میں ہے۔ ''مریم اور اس کی بہن مرتھا کے گاؤں بیت عنیاہ کا لعزر نام ایک آدمی بیمار تھا، یہ وہی مریم تھی جس نے خداوند پر عطر ڈال کر اپنے بالوں سے اس کے پاؤں پونچھے۔ اسی کا بھائی لعزر بیمار تھا..... اور یسوع مرتھا اور اس کی بہن (مریم) اور لعزر سے محبت رکھتا تھا''۔ (۳/۷ الف)

دیکھئے بہ مطابق اناجیل حضرت یسوعؑ کے پاؤں ایک غیر محرم اور اجنبی عورت نے چومے اور ان پر عطر ڈالا حالانکہ یہ عورت (مبینہ طور پر) بدچلن اور فاحشہ تھی اور بہ مطابق انجیل یوحنا حضرت یسوعؑ اس عورت، اس کی بہن مرتھا اور اس کے بھائی لعزر سے محبت رکھتے تھے۔ ادھر رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز کسی فاحشہ عورت سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھا، کسی فاحشہ اور غیر محرم عورت نے آپ کے پاؤں چومنے کی جسارت نہیں کی اور نہ ہی آپ نے کبھی کسی ایسی خاتون سے اپنے سر اور پاؤں پر مالش

کروائی۔ فاحشہ عورتیں تو ایک طرف رہیں آپ نے کسی پاک دامن غیر محرم عورت کے جسم کو بھی کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اب اگر حضرت یسوعؑ پر بدگمانی کی کسی کے پاس ہرگز گنجائش نہیں تو رسول اکرم ﷺ پر بھی کسی اعتراض کا کوئی موقع نہیں۔ حضرت زینبؓ بنت جحش تو حضرت زیدؓ بن حارثہ سے طلاق پانے اور عدت پوری کرنے کے بعد آپ کے نکاح میں آئیں جب کہ حضرت یسوعؑ کا نکاح مریم مگدلینی سے نہ پہلے تھا اور نہ بعد میں ہوا۔ پھر حضرت زینبؓ نہایت پاک دامن خاتون تھیں۔ جب کہ مریم مگدلینی بہ مطابق اناجیل بدچلن تھی۔ اہلِ کتاب نے صرف حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) کی نسل بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے نبیوں پر بہتان تراشی نہیں کی بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے عم عصر اور ان کے قریبی رشتہ دار حضرت لوطؑ بھی ان کی بہتان تراشیوں سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان پر یہ شرم ناک الزام لگایا کہ ان کی دو بیٹیوں نے انہیں یکے بعد دیگرے دو رات (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) شراب پلائی تھی جس کے نشے کے زیرِ اثر آپ نے اپنی ان دونوں بیٹیوں سے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) شب باشی کی اور حاملہ ہوئیں۔ اس حمل سے ان سے بڑی بیٹی سے پیدا ہونے والے کا نام بہ مطابق بائبل موآب تھا جو موآبیوں کا باپ ہے اور چھوٹی بیٹی سے بن عمی پیدا ہوا تھا جو بنی عمون کا باپ ہے (۷۳/ب) یعنی موآب اور بن عمی (معاذ اللہ) دونوں ولد الزنا ہیں لیکن انہی سے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے واسطے سے عیسائیوں نے حضرت یسوعؑ کا ننھیالی رشتہ بھی قائم کر رکھا ہے۔ یہاں بھی اہلِ کتاب کا حضرت لوطؑ پر بہتان لگانے کے سلسلے میں جھوٹا ہونا خود بائبل سے ہی واضح ہو رہا ہے چنانچہ نئے عہد نامے میں شامل پطرس کے خط میں لکھا ہے۔ ''اور راست باز لوط کو جو بے دینوں کے ناپاک چال چلن سے دق تھا، رہائی بخشی'' (۷۳/ج) اس خط میں پطرس نے حضرت لوطؑ کے لئے راست باز کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بنی اسرائیل میں بہ مطابق بائبل ایک نبی حضرت سمسونؑ ہیں ان پر بھی بہتان لگایا گیا ہے چنانچہ کتاب قضاۃ میں ہے

پھر سمسون غزہ کو گیا وہاں اس نے ایک کسبی دیکھی اور اس کے پاس گیا۔ (۷۴/الف)

اور اسی کتاب قضاۃ میں ہے کہ اس کے بعد وادی سورق کی دلیلہ نامی ایک عورت سے انہوں نے معاذ اللہ معاشقہ لڑایا۔ دلیلہ سمسون کی قوت کا راز معلوم کرنا چاہتی تھی جس سے فلسطین کے کافر لوگ سمسون پر غالب آسکیں مگر دلیلہ کو سمسون نے یہ راز نہ بتایا اور اس سے تین مرتبہ (معاذ اللہ) جھوٹ بولا۔ جب دلیلہ نے بار بار اپنی محبت کا حوالہ دیا تو سمسون نے یہ کہہ کر راز اگل دیا کہ ان کی قوت ان کے سر کے بالوں میں ہے۔ اس کے بعد دلیلہ نے موقع پا کر سمسون کو اپنے گھٹنے پر سلا دیا اور فلسطینی سرداروں کو بلا کر ایک حجام کے ذریعے ان کے سر کے بال منڈوا دیئے جس سے ان کی قوت ختم ہوگئی اور دشمنوں نے انہیں پکڑ کر ان کی

آنکھیں نکال ڈالیں اور قید خانے میں ڈال دیا جہاں وہ بالآخر فوت ہوگئے (۴۷/ ب) یہاں بھی اہل کتاب کا جھوٹا ہونا خود بائبل ہی سے ثابت ہورہا ہے کیونکہ ان کے متعلق کتاب قضاۃ میں ہے وہ لڑکا (یعنی سمسون) پیٹ ہی سے خدا کا نذیر ہوگا (۴۷/ ج)

جب سمسون پیٹ ہی سے خدا کے نذیر اور نبی تھے تو ان کے وہ کرتوت ہرگز نہیں ہوسکتے جو اہل کتاب نے ان کی طرف منسوب کررکھے ہیں۔ جب نبیوں پر شرم ناک بہتان عائد کرنے میں اہل کتاب اتنی لذت محسوس کرتے ہوں کہ بائبل کے انبیاء علیہم السلام بھی ان کی زد سے نہ بچ سکے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر خواتین وغیرہ کے سلسلے میں بھی ان کے الزامات لغو اور کالعدم ہیں۔ اگر حضرت لوطؑ اور سمسونؑ کے متعلق الزامات میں اہلِ کتاب اپنے آپ کو سچا سمجھتے ہیں اور اگر بائبل کے یہ (خبیث) مضامین ان کی نظر میں مقدس اور الہامی ہیں تو حضرت زینبؓ اور حضرت ماریہ قبطیہؓ کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اہل کتاب کے الزامات تو ان کے مقابلے میں پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ اہل کتاب کے عائد کردہ سنگین اور شرم ناک الزامات سے اگر حضرت لوطؑ، سمسون اور دیگر انبیاء مثلاً حضرت یعقوبؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی قدر منزلت ان اہل کتاب کے نزدیک متاثر نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کا منصب نبوت خلل پذیر ہوتا ہے تو بھلا رسول اکرم ﷺ کے مقام اور مرتبے میں کون سی کمی واقع ہوجائے گی؟ آپ نے تو (معاذ اللہ) کسی کسبی سے کبھی زنا نہیں کیا اور نہ ہی دلیلہ جیسی کسی عورت سے کبھی (معاذ اللہ) معاشقہ لڑایا نہ ہی (معاذ اللہ) آپ نے کبھی شراب نوشی کی جس کے زیر اثر آپ نے (معاذ اللہ) کسی سے کوئی برا کام کیا ہو۔ ہم نے اہل کتاب کو الزام دینے کے لئے مجبوراً بائبل کی یہ خرافات لکھی ہیں ورنہ ہم ان سے ہزار بار اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان میں ادنیٰ گستاخی کو بھی کفر سمجھتے ہیں۔

جنگوں میں پکڑی جانے والی عورتوں اور بچوں کے متعلق بائبل کی کتاب گنتی میں حضرت موسیٰؑ کا فرمان یوں دیا گیا ہے۔ ''اس لئے ان بچوں میں جتنے لڑکے ہیں سب کو مار ڈالو اور جتنی عورتیں مرد کا منہ دیکھ چکی ہیں ان کو قتل کر ڈالو۔ لیکن ان لڑکیوں کو جو مرد سے واقف نہیں اور اچھوتی ہیں اپنے لئے زندہ رکھو'' (۷۵/ الف) یہ محرف بائبل کے ناقابل اعتماد مضامین ہیں لیکن اہلِ کتاب انہیں الہامی گردانتے ہیں۔ لہٰذا ان پر حجت ہیں ادھر شریعت محمدیہ ﷺ میں بچوں اور عورتوں کو قتل کر ڈالنا ہرگز جائز نہیں۔ جنگوں میں پکڑی جانے والی عورتیں شادی شدہ ہوں یا کنواری ہوں، اگر انہیں لونڈیاں بنایا گیا ہو تو اہل کتاب کو رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب پر اعتراض کا قطعاً حق حاصل نہیں۔ غزوہ بنی قریظہ میں حضرت

ریحانہؓ بنت شمعون کو رسول اکرم ﷺ کی کنیز بننے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ خاندانِ بنی قریظہ یا بنی نضیر سے تھیں ان کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ آپ نے انہیں آزاد کر کے ان سے شادی کر لی تھی۔ دورِ نبوی میں کسی بھی خاتون کا رسول اکرم ﷺ سے تعلق خواہ نکاح کے ذریعے ہو یا وہ خاتون آپ کی لونڈی بنی ہو، دونوں صورتوں میں اس خاتون کے لئے انتہائی شرف و احترام کا سبب خیال کیا جاتا تھا۔ جب موسوی شریعت میں جنگ میں پکڑی جانے والی عورتوں کو لونڈی بنانے کی بھرپور اجازت اور گنجائش موجود تھی تو اہل کتاب کا حضرت ریحانہؓ کے بارے میں رسول اکرم ﷺ پر معترض ہونا محض جہالت یا تعصب کی بنا پر ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل تھا کہ آپ اپنے اصحاب کے اخلاق و عادات کو سنواریں۔ اصلاح کے لئے ترغیب و ترہیب، نرمی و سختی دونوں طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ازواج مطہرات بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہ تھیں چنانچہ قرآن کریم میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ (پیغمبر) تمہیں طلاق دے دے تو عجب نہیں کہ اس کا رب اسے تم سے بہتر بیویاں دے دے جو مسلمان، صاحبِ ایمان، فرماں بردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، روزہ رکھنے والیاں ہوں۔ (خواہ وہ) بیوہ ہوں یا کنواریاں ہوں (۷۵/ب) چونکہ ازواج مطہرات نے اخلاقی تزکیے و تطہیر کے مطلوبہ مراحل بہ خوبی طے کر لئے اس لئے اس کی کبھی نوبت نہ آئی کہ رسول اکرم ﷺ انہیں طلاق دے کر اپنے سے الگ کر دیں اور ان کی جگہ دوسری خواتین کو اپنے نکاح میں لائیں۔ امّ المومنین حضرت سودہؓ بنت زمعہ کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے سودہؓ کے عمدہ اخلاق اتنے محبوب تھے کہ میں چاہتی تھی کہ میں ان کی جگہ ہوتی لیکن ان کے مزاج میں (بشری کم زوری کی بنا پر) خاصی تیزی تھی اور وہ جلد ہی لعن طعن پر اتر آتی تھیں (۷۵/ج) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلاق دینے کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ میں دنیا اور آخرت میں بہر حال آپ کی ازواج میں شامل رہنا چاہتی ہوں، مجھے طلاق نہ دیجئے میں اپنی باری حضرت عائشہ کے لئے ہبہ کرتی ہوں (کیونکہ حضرت سودہؓ بڑھاپے کی منزل میں تھیں) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس درخواست کو شرف قبولیت بخشا (۷۶/الف)

بائبل کی کتاب سموئیل دوم میں حضرت داؤدؑ کے متعلق یہ مضمون ملتا ہے اور داؤد یروشلم میں اپنے محل میں آیا اور بادشاہ (یعنی داؤد) نے اپنی ان دس حرموں کو جن کو وہ اپنے گھر کی نگہ بانی کے لئے چھوڑ گیا تھا، لے کر ان کو نظر بند کر دیا اور ان کی پرورش کرتا رہا پر ان کے پاس نہ گیا سو انہوں نے اپنے مرنے کے دن تک نظر بند رہ کر رنڈاپے کی حالت میں زندگی کاٹی"۔ (۷۶/ب) دیکھئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی اپنی کسی بیوی یا حرم کو نظر بند نہیں کیا کہ اسے مرتے دم تک رنڈاپے کی زندگی کاٹنے پر مجبور کیا گیا ہو، لہٰذا امّ

المومنین حضرت سودہؓ کے بارے میں بھی اہل کتاب کو آپ پر کسی اعتراض کا قطعاً کوئی حق نہیں پہنچتا۔

(د) عمر عائشہ صدیقہؓ و دیگر متعلقہ اہم مباحث

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی اپنی روایت کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ میں ان کے نکاح کے وقت ان کی عمر چھ سال اور مدینہ منورہ میں رخصتی کے وقت عمر نو سال تھی۔ اس پر بعض حلقوں کی طرف سے اعتراض کے سلسلے میں درج ذیل امور توجہ طلب ہیں:

۱۔ کتب حدیث میں موجود اقوالِ صحابہؓ پر حدیث کی اصطلاح کا اطلاق توسُّعاً یعنی حدیث کے مفہوم میں وسعت پیدا کرتے ہوئے کر دیا جاتا ہے۔ اگر صحابی کا قول و فعل غیر مُدرَک بالقیاس ہو یعنی ایسا ہو کہ جس کے متعلق یہ سوچا بھی نہ جا سکتا ہو کہ صحابی نے اپنی عقل اور رائے سے بیان کیا ہے بلکہ صاف معلوم ہو رہا ہو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کئے بغیر صحابی یہ بات نہیں کہہ سکتا یا یہ کام نہیں کر سکتا تو صحابی کے ایسے قول و فعل کو حدیثِ مرفوع کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر صحابی کا قول و فعل مُدرک بالقیاس ہو یعنی اس بات کا امکان موجود ہو کہ یہ صحابی کی اپنی رائے اور اجتہاد پر مبنی ہے تو دلائل اور قرائن کی بنا پر اس سے اختلاف کی گنجائش موجود ہوتی ہے، کیونکہ صحابہ کرامؓ انتہائی واجب الاحترام اور امت کا اولین اور افضل ترین طبقہ ہونے کے باوجود فرداً فرداً معصوم عن الخطاء نہیں ہیں۔ اپنی عمر کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قول مُدرک بالقیاس ہے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں اور حضرت عائشہ صدیقہؓ معصوم عن الخطاء نہیں کہ ان کے اس طرح کے کسی قول میں خطا کا سرے سے احتمال نہ ہو۔

۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے وقت اپنی عمر کے متعلق حضرت عائشہؓ کی چھ سال کی ہی نہیں بلکہ سات سال والی روایت بھی موجود ہے (۷۶/ ج) دونوں میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ چھ سال کے ساتھ اگر مثلاً سات یا آٹھ مہینے بھی ہوں تو بہ حذفِ کسر مدت چھ سال اور بہ شمول کسر سات سال بنے گی لہٰذا سات سال والی روایت کو ترجیح حاصل ہوگی۔ اہل سیر میں اس امر میں اختلاف ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد رسول اکرم ﷺ سے حضرت عائشہؓ کا نکاح پہلے ہوا تھا یا حضرت سودہؓ بنت زمعہ آپ کے نکاح میں پہلے آئی تھیں۔ علامہ ابن کثیرؒ کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نکاح پہلے ہوا تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے مسند امام احمد بن حنبلؒ میں حضرت عائشہؓ سے مروی روایت سے استدلال کیا ہے (۷۷/ الف) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی حضرت عائشہؓ سے مروی ابن ابی حاتم کی روایت بیان کی ہے جس میں تصریح ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح حضرت سودہؓ سے پہلے ہوا تھا (۷۷/ ب)

بہر حال اہل سیر نے حضرت عائشہؓ کے نکاح کا مہینہ شوال ۱۰ نبوی/ جون، جولائی ۶۱۹ء بیان کیا ہے اور ان کی رخصتی کا مہینہ شوال ۱ ہجری بہ مطابق شوال ۱۴ نبوی/ جون، جولائی ۶۲۳ء ہے۔ جب وہ اپنی ایک روایت کے مطابق اپنے نکاح کے وقت سات سال کی تھیں تو رخصتی کے وقت ان کی عمر (۷+۴) = گیارہ سال بنتی ہے نہ کہ نو سال۔ اور اگر نکاح کے وقت عمر چھ سال کی بھی لی جائے تو رخصتی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر (۶+۴) = دس سال بنتی ہے۔ یہ قرین قیاس نہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ حساب میں اس قدر کم زور ہوں کہ چھ کو چار میں جمع کرنے سے مدت نو سال برآمد کریں لہٰذا یہ بعد کے کسی راوی کا وہم ہوسکتا ہے جو نقل در نقل آگے منتقل ہوتا چلا آیا۔ اصول درایت کی بنا پر متعلقہ روایت میں اتنی واضح غلطی اسے محل نظر بنا رہی ہے۔ اہل سیر کے برعکس مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوریؒ نے الرحیق المختوم میں حضرت سودہؓ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کا مہینہ شوال ۱۰ نبوی اور حضرت عائشہؓ سے نکاح کا مہینہ شوال ۱۱ نبوی بیان کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر اس وقت چھ برس تھی۔ مولانا نے غالباً ایسا اس لئے کیا ہے تاکہ حضرت عائشہؓ کی اپنی عمر کے متعلق روایت پر مذکورہ بالا قوی اشکال وارد نہ ہو۔ لیکن انہوں نے اس پر کوئی ثبوت پیش نہیں کیا اور نہ ہی یہ وضاحت فرمائی کہ جب حضرت عائشہؓ سے نکاح کے وقت سات سال والی روایت بھی صحیح بخاری وغیرہ میں موجود ہے تو انہیں اور دیگر اہل علم کو چھ سال والی روایت ہی سے زیادہ دل چسپی کیوں ہے؟ حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ دونوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت عثمانؓ بن مظعون کی اہلیہ حضرت خولہؓ بنت حکیم کی تجویز پر ہوا تھا۔ حضرت خولہؓ نے ہر دو خواتین سے نکاح کی تجویز ایک ہی وقت میں رسول اکرم ﷺ کے سامنے رکھی تھی اس لئے دونوں کے نکاح میں خواہ مخواہ ایک سال کا وقفہ ڈال دینا قرین فہم نہیں۔ یہ دونوں نکاح قریب قریب ہی ہوئے ہیں اسی لئے تو اہل سیر میں اختلاف ہوا کہ کون سا نکاح پہلے اور کون سا بعد میں ہوا۔ اگر دونوں کے نکاح میں سال بھر کا وقفہ ہوتا تو بہ ظاہر اس اختلاف کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ ہی نہ ہوتی۔

۳۔ اگر حضرت عائشہؓ کی چھ اور سات سال والی روایت میں ممکنہ خطا کے تمام احتمالات کی نفی بھی کردی جائے تو بھی رخصتی کے وقت ان کی عمر گیارہ سال بنتی ہے جیسا کہ اوپر نکتہ ۲ میں واضح کیا جاچکا ہے۔ امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت عمرؓ بن خطاب اور حضرت انسؓ بن مالک سے مروی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث لکھی ہے کہ تورات میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اگر کسی شخص کی بیٹی بارہ سال کی عمر کو پہنچ جائے اور وہ اس کی شادی نہ کرے تو لڑکی کے گناہ میں مبتلا ہوجانے کی صورت میں اس کا وبال اس کے باپ پر (بھی) ہوگا (۷۷/ ج) گیارہ اور بارہ سال کی عمر میں چنداں فرق نہیں۔ اچھی صحت والی اور عمدہ قد وقامت

کی مالک گیارہ سالہ لڑکیاں اکثر و بیشتر حد بلوغ کو پہنچ چکی ہوتی ہیں۔ تاہم ہماری نظر میں چھ یا سات سال والی عمر کی روایت میں خطا کے احتمال پر بعض قوی قرائن موجود ہیں جن کا ذکر آئندہ نکات میں کیا جا رہا ہے۔

۴۔ عربوں میں تعلیم و تعلم کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ سالوں کے شمار کے لئے ان کے ہاں کوئی یک ساں تقویمی نظام سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ لوگ اپنے طور پر مشہور واقعات کو بنیاد بنا کر سالوں کو شمار میں لاتے تھے۔ جو واقعہ جس کی نظر میں زیادہ اہم ہوتا اسی کو وہ سالوں کے شمار کی بنیاد اپنے طور پر ٹھہرا لیتا تھا۔ اس تقویمی افراتفری اور انتشار کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کتبِ تاریخ میں مذکور مشاہیر (مشہور حضرات) کی عمروں میں بڑا تفاوت پایا جاتا ہے۔ مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد حضرت عبدالمطلب کی عمر کے متعلق ۸۲، ۸۵، ۹۵، ۱۱۰، ۱۲۰ سال کے اقوال ملتے ہیں (۷۸/ الف) امّ المومنین حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے وقت رسول اکرم ﷺ کی عمر مبارک مشہور قول کے مطابق ۲۵ سال کی تھی لیکن ۲۱، ۳۰، ۳۷ سال وغیرہ کے اقوال بھی ہیں (۷۸/ ب) اور حضرت خدیجہؓ کی عمر اس وقت مشہور قول کے مطابق چالیس سال تھی لیکن ۲۵، ۳۵ سال کے اقوال بھی ملتے ہیں (۷۸/ ج) عمروں کے اس غیر معمولی تفاوت پر غور کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اپنے طور پر مشہور واقعات سے سال شماری کرتے وقت کسی کی اصل عمر کے کم یا زیادہ سالوں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اس کا نمایاں ثبوت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزیز ترین صاحب زادی سیدہ فاطمہ زہراؓ کی عمر کے متعلق اختلافی اقوال سے ملتا ہے۔ بہ قول واقدی سیدہ فاطمہؓ کی ولادت باسعادت ۳۵ عام الفیل میں ہوئی اور اس کے صحیح ہونے پر مدائنی کا بھی اصرار ہے لیکن ابوعمر کا قول ہے کہ ان کی ولادت کا سال ۴۱ عام الفیل ہے۔ اور آپ حضرت عائشہؓ سے عمر میں کوئی پانچ سال بڑی تھیں (۷۹/ الف) قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ سیرت پر اپنی کتاب رحمۃ للعالمین میں سیدہ فاطمہؓ کی عمر کے متعلق فرماتے ہیں: ''سیدہ کی عمر کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ قدیم سے اختلاف چلا آتا ہے۔ زبیر بن بکار سے روایت ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے پاس حضرت عبداللہ بن حسن بن امام حسنؓ آئے۔ وہاں کلبی پہلے سے موجود تھا۔ ہشام نے دریافت کیا کہ سیدہ فاطمہ کی عمر کیا تھی؟ عبداللہ نے کہا تیس سال۔ کلبی نے کہا پینتیس سال، ہشام نے کہا ابومحمد سنتے ہو کہ کلبی جو تاریخ میں سربرآوردہ ہے، کیا کہتا ہے؟ انہوں نے کہا میری ماں کا حال مجھ سے دریافت کیجئے اور کلبی کی ماں کا حال کلبی سے پوچھ لیجئے''۔ (۷۹/ ب)

ایک اور مقام پر قاضی منصور پوریؒ لکھتے ہیں: ''واضح ہو کہ اصول کافی میں شیخ محمد کلینی نے ولادت سیدہ ۵ نبوت بتائی ہے اور عمر بہ وقت وفات ۱۸ سال ۷۵ یوم۔ جس میں سے ۷۵ یوم بعد از وفات نبوی تھے۔ ولادت امام حسنؓ ۲ ہجری بتائی ہے۔ اندریں صورت عمر سیدہ بہ وقت ولادت امام حسنؓ صرف دس

سال ہوتی ہے اور اگر ولادت امام حسنؓ ۳ ہجری مان لی جائے جیسا کہ اسی کتاب کی دوسری روایت میں ہے، تب عمر سیدہ گیارہ سال ہوگی اسی لئے میں نے الاستیعاب کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ (الاستیعاب میں سیدہ فاطمہؓ کی ولادت کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی ولادت نبی ﷺ کی عمر مبارک کے اکتالیسویں سال میں ہوئی) مدائنی نے ولادت سیدہ پانچ سال قبل از نبوت اور عمر بہ وقت وفات ۲۹ سال تحریر کی ہے (۷۹/ ج)

دیکھئے بعثتِ نبوی سے پہلے مشہور ترین واقعہ خانہ کعبہ کی تعمیر نو کا ہے جو مشہور ترین قول کے مطابق ۳۵ عام الفیل یا ۳۵ میلادی کا واقعہ ہے یاد رہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ابرہہ والیٔ یمن کے مکہ مکرمہ پر ناکام حملے کے کوئی پچاس دن بعد ہوئی تھی۔ ابرہہ کے لشکر میں فیل (ہاتھی) بھی تھے اس لئے اس سال کو عام الفیل کہا جاتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی ولادتِ مبارکہ بھی چونکہ اسی سال ہوئی تھی اس لئے عام الفیل کو سال ولادتِ نبویہ یا سال میلادی بھی کہا جاتا ہے۔ الغرض ۳۵ میلادی کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دوسرا نہایت اہم واقعہ ہے جس کا سال ۴۱ عام الفیل یا ۴۱ میلادی ہے۔ کسی نے سال شماری کے لئے خانہ کعبہ کی تعمیر کو بنیاد بنایا تو کسی نے بعثتِ نبوی کے سال کو بنیاد بنایا۔ ادھر صحیحین (بخاری و مسلم) و دیگر بعض کتب حدیث میں روایت موجود ہے کہ جب سورہ شعراء کی آیت وانذر عشیرتک الاقربین (یعنی اے پیغمبر تو اپنے قریبی رشتے داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرا) نازل ہوئی تو رسول اکرم ﷺ نے قریش مکہ کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہوئے فرمایا:

> تم اپنی جانوں کا بچاؤ کرو، (تمہارے انکار کی صورت میں) میں اللہ کے مقابلے میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا، اے عباس بن عبدالمطلب! میں اللہ کے مقابلے میں تیرے کام نہیں آسکتا، اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صفیہ! میں اللہ کے مقابلے میں تیرے کام نہیں آسکتا اور اے محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ! تو مجھ سے میرے مال میں سے جو چاہے مجھ سے مانگ لے (لیکن) اللہ کے مقابلے میں، میں تیرے کچھ کام نہیں آسکتا۔ (۸۰/ الف)

قریبی رشتے داروں تک پیغامِ حق پہنچانے یعنی دعوتِ ذی العشیرہ کا واقعہ اواخر ۴ نبوی بہ مطابق ۴۴ عام الفیل بہ مطابق جولائی / اگست ۶۱۳ء میں پیش آیا جب کہ خفیہ تبلیغ کے تین سال پورے ہو چکے تھے۔ اگر اصول کافی کی مذکورہ بالا روایت کو قبول کیا جائے کہ سیدہ فاطمہ کی ولادت ۵ نبوی بہ مطابق ۴۵ عام الفیل میں ہوئی تھی تو دعوتِ ذی العشیرہ کے وقت تو سیدہ فاطمہؓ کا کوئی وجود ہی نہیں تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سی فاطمہ بنتِ محمد کو نصیحت فرمائی تھی؟۔ اور اگر ۴۱ عام الفیل میں سیدہ کی ولادت کی روایت کو قبول کیا جائے تو دعوتِ ذی العشیرۃ کے وقت ان کی عمر کوئی تین سال بنے گی، لہٰذا یہ روایت بھی

قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ عبداللہ بن حسن بن امام حسنؓ نے حضرت فاطمہ کی عمر جو تیئس سال بتائی ہے اس حساب سے ان کی ولادت کوئی ۳۳ عام الفیل کی بنتی ہے، جب کہ دعوتِ ذی العشیرہ کا واقعہ اواخر ۴ نبوی بہ مطابق اواخر ۴۴ عام الفیل ہے۔ اس حساب سے اس وقت سیدہ کی عمر گیارہ سال تھی۔ رسول اکرم ﷺ نے جس اہتمام اور سنجیدگی سے اس موقع پر انہیں مخاطب کر کے نصیحت فرمائی ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی عمر کم از کم دس یا گیارہ سال کے قریب ہو، چنانچہ دس سال کی عمر کے بچے کو نماز کا عادی بنانے کے لئے تادیباً مارنے کی بھی گنجائش ہے۔

عمروں کے متعلق اختلافی اقوال میں اہل سیَر اکثر و بیشتر مشہور اقوال کو ترجیح دیتے ہیں، خصوصاً جب کہ ان اقوال میں دیگر وجوہ ترجیح موجود نہ ہوں یا ذہن کی وہاں تک رسائی نہ ہوسکے۔ عمروں کے اختلاف کی تاریخی جزئیات کا چونکہ اکثر و بیشتر دین سے تعلق نہیں ہوتا، لہٰذا تحقیق کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی جاتی لیکن اگر کسی تاریخی جزیئے کو مخالفین و معاندین دین میں عیب جوئی کے لئے بدنیتی سے یا غلط فہمی سے استعمال کرتے ہوں تو حتیٰ الامکان اصل حقائق تک رسائی کے لئے تحقیق و تدقیق کی بجا طور پر ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ سیدہ فاطمہؓ کی ولادت کے سلسلے میں چونکہ ۳۵ عام الفیل کا قول زیادہ مشہور ہے اس لئے عموماً اسی کو قبول کیا جاتا ہے لیکن مذکورہ وضاحت سے ۳۳ عام الفیل میں ان کی ولادت کا ہونا راجح معلوم ہو رہا ہے۔

۵۔ بعثت کے بعد مکہ مکرمہ کے نبوی دور میں سب سے پہلا اہم واقعہ یہی دعوتِ ذی العشیرہ کا ہے۔ اس موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا بولہب عبدالعزّیٰ بن عبدالمطلب نے بدتمیزی اور درشتی کا مظاہرہ کیا۔ رسول اکرم ﷺ کی دو صاحب زادیوں حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کا نکاح ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کے ساتھ پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ ابولہب کے متعلق قرآن کریم میں سورہ لہب کے نزول نے اس کی آتش غضب کو اور بھی بھڑکا دیا۔ اس کے اور اس کی بیوی امّ جمیل کے کہنے پر عتبہ اور عتیبہ نے رسول اکرم ﷺ کی صاحب زادیوں کو طلاق دے دی۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ رسول اکرم ﷺ کے دیرینہ رفیق اور بالغ مردوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے ہیں۔ ان کا ان واقعات سے گہرا اثر قبول کرنا عین فطری و طبعی امر ہے اس لئے حضرت ابوبکر صدیق کے گھرانے کے لئے دعوتِ ذی العشیرہ کا واقعہ اتنا اہم تھا کہ سال شماری کے لئے اس وقت کے رواج کے مطابق انہوں نے غالباً اسے بنیاد ٹھہرایا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے نکاح کا مہینہ شوال ۱۰ نبوی ہے جو دعوتِ ذی العشیرہ کے چھ سال بعد کا بنتا ہے یوں حضرت عائشہؓ کی عمر چھ یا سات سال کی سمجھ لی گئی اور عین ممکن

ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے یہی ظاہر فرمایا ہو کہ نکاح کے وقت دعوتِ ذی العشیرہ کے بعد ان کی عمر کے چھ سال اور رخصتی کے وقت نو سال اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت اٹھارہ سال گزر چکے تھے (لیکن اس میں بھی حساب میں ایک سال کم شمار کیا گیا ہے) اور سننے والوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہو کہ نکاح کے وقت ان کی اصل عمر چھ سال تھی۔ حضرت عائشہؓ واحد نوعمر کنواری خاتون تھیں جو رسول اکرم ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ اپنی عمر کے متعلق بعض اوقات خواتین کا انداز گفتگو اور پیرایۂ بیان لوگوں کے لئے غلط فہمی کا باعث بن سکتا ہے، مثلاً حضرت عائشہ صدیقہؓ ہی کی روایت کے مطابق رسول اکرم ﷺ غزوہ تبوک یا غزوہ حنین سے واپس تشریف لائے تو گھر میں ایک طاق میں پڑی ان کی گڑیوں کا پردہ ہوا سے کھل گیا۔ رسول اکرم ﷺ کے دریافت فرمانے پر حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ یہ میرے کھلونے ہیں۔ آپ نے ان کھلونوں میں ایک گھوڑا بھی دیکھا جس کے دو پر بھی کپڑے کے لگے ہوئے تھے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کے بھی تو پر ہوتے تھے۔ اس جواب نے رسول اکرم ﷺ کو ہنسنے پر مجبور کر دیا کہ حضرت عائشہؓ کو آپ کے دندانِ مبارک نظر آئے (۸۰/ ب) عوام میں مشہور تھا کہ پہلے گھوڑوں کے پر ہوا کرتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ نے اس وجہ سے ان کے پر کٹوا دیئے کہ گھوڑوں کی دیکھ بھال میں ایک مرتبہ ان کی نماز قضا ہوگئی تھی۔ اس وقت سے ان کے پَر جاتے رہے لیکن نشان اب بھی باقی ہے۔ حضرت عائشہؓ کا اشارہ اسی واقعے کی طرف تھا۔ غزوہ تبوک سے رسول اکرم ﷺ کی واپسی رمضان ۹ ہجری قمریہ شمسی بہ مطابق صفر ۱۰ ہجری قمری بہ مطابق مئی، جون ۶۳۱ عیسوی جیولین میں ہوئی تھی۔ اگر سال ۱ ہجری میں حضرت عائشہؓ کی عمر ۹ سال کی بھی لی جائے تو بھی غزوہ تبوک کے ایام میں ان کی عمر سترہ سال سے کم نہیں ہوسکتی اور اگر نکاح کے وقت ان کی اپنی ہی دوسری روایت کے مطابق عمر سات سال ہو تو یہ عمر غزوہ تبوک کے بعد ۱۹ سال سے کسی صورت میں کم نہیں ہوسکتی۔ بہ ظاہر یہ عمر گڑیوں اور کھلونوں سے کھیلنے کی نہیں ہے گڑیوں اور کھلونوں سے حضرت عائشہؓ کی دل چسپی کی وجہ ان کی ایک دوسری روایت سے واضح ہو جاتی ہے کہ گھر میں چھوٹی بچیاں آکر میرے ساتھ ان کھلونوں سے کھیلا کرتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ اتفاقاً تشریف لاتے تو لڑکیاں بھاگ جاتیں اور آپ انہیں واپس لے کر آتے اور میرے پاس بھیج دیتے (۸۰/ ج) جیسا کہ قبل ازیں ہم بیان کر چکے ہیں حضرت عائشہؓ واحد نوعمر کنواری خاتون تھیں جو آپ کے نکاح میں آئیں رسول اکرم ﷺ سے ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی اس لئے ممتا کے جذبے کی تسکین کے تحت انہیں گھر میں آنے والی محلے کی ان چھوٹی بچیوں سے طبعاً مادرانہ رغبت تھی اور انہی کی خاطر حضرت عائشہؓ نے یا تو اپنے پرانے کھلونے سنبھال کر رکھے تھے یا ان بچیوں کے

کھلونوں کو اپنے پاس سنبھال رکھتی تھیں تا کہ یہ بچیاں ان کے ساتھ مانوس رہیں اور آتی جاتی رہیں۔ حضرت عائشہؓ کا کھلونوں میں پردار گھوڑے کے متعلق حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کا حوالہ دینا ان کی لطیف حسِ مزاح کو ظاہر کرتا ہے جس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہنس دیئے لیکن دیکھئے اکثر حضرات بلکہ اہلِ علم نے بھی حضرت عائشہؓ کے اندازِ بیان سے اسے غلطی سے ان کی بچپن کی معصومیت سمجھ لیا۔ الغرض حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب اسی طرح کی روایات سے ان کے نہایت کم عمر ہونے پر استدلال چنداں وزن نہیں رکھتا۔

۶۔ مشہور سیرت نگار ابن ہشام نے مردوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں جہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر کیا ہے تو وہیں ان کی دعوت پر اسلام قبول کرنے والے جن لوگوں کے نام لکھے ہیں ان میں ان کی دونوں صاحب زادیوں حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ کے نام بھی شامل ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ اس وقت چھوٹی تھیں (۸۱/ الف) ابن ہشام کی اس روایت سے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کم از کم سات آٹھ برس کی ہوں گی۔ اور دعوتِ ذی العشیرہ کے وقت ان کی عمر کوئی گیارہ سال اور نکاح کے وقت (۱۱+۶) = ۱۷ سال ہوگی۔ دعوتِ ذی العشیرہ کے بعد کے چھ سال تو شمار کر لئے گئے لیکن اس سے پہلے کے سالوں کو اسی طرح نظر انداز کر دیا گیا جیسے بعض حضرات نے سیدہ فاطمہؓ کی عمر کے ۴۱ عام الفیل میں رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد کے سال تو شمار کر لئے اور پہلے کے سات یا آٹھ سال نظر انداز کر دیئے۔ یا جیسے اصول کافی کے مؤلف شیخ کلینی کی روایت میں سال ۵ نبوی میں ہجرتِ حبشہ کے مشہور واقعے کو سال شماری کی بنیاد بناتے ہوئے سیدہ فاطمہ کی ولادت ۵ نبوی ظاہر کی گئی ہے اور اس سے پہلے کے بارہ سالوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ گمانِ غالب یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر نکاح کے وقت سترہ سال سے کم نہیں تھی۔ حضرت عائشہؓ اور ان کے والدین اسی عرب معاشرے کا حصہ تھے جو تقویمی انتشار کا شکار تھا۔ عام الفیل کو بھی سب نے سال شماری کے لئے متفقہ بنیاد نہیں ٹھہرایا۔ ورنہ عمروں کے متعلق اختلافات ختم نہ بھی ہوتے تو کم سے کم ضرور ہو جاتے۔ عام الفیل کو سال شماری کے لئے بہت بعد میں متفقہ طور پر بنیاد بنایا گیا تا کہ متعلقہ تاریخی مباحث میں مزید توقیتی الجھاؤ سے بچا جا سکے۔ الغرض نکاح کے وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر سترہ سال سے کم نہیں تھی۔ نکاح کے بعد ان کی فوری رخصتی نہ ہونے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان دنوں نہایت ہی پُر آشوب حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولیں گھریلو ضرورت یہ تھی کہ کوئی تجربہ کار خاتون آپ کے امور خانہ داری کو سنبھالے اور یہ مقصد حضرت سودہؓ کی رخصتی سے پورا ہو گیا۔ جو معمر بیوہ اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ اس لئے حضرت عائشہؓ کی رخصتی کو ہجرتِ مدینہ تک مؤخر کر دیا گیا۔

طبقاتِ ابنِ سعد میں ہجرتِ مدینہ کے متعلق حضرت عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خواہش تھی کہ حضرت عائشہؓ کی رخصتی جلد ہو لیکن اس وقت کی معاشی مشکلات کی بنا پر رسول اکرم ﷺ کے پاس مہر کی ادائیگی کے لئے رقم نہیں تھی۔ ہجرتِ مدینہ کا مہینہ ربیع الاول ۱ ہجری (قمریہ شمسی) اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی کا مہینہ شوال ۱ ہجری (قمریہ شمسی) ہے۔ اگر حضرت عائشہ صدیقہؓ ان دنوں صرف نو یا دس سال کی ہوتیں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کی جلد رخصتی کے خواہاں نہ ہوتے۔

۷۔ اپنی رخصتی کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے کہ وہ باہر اپنی سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں کہ انہیں گھر میں بلایا گیا اور ان کی والدہ نے ان کا منہ دھلا کر ان کے بال سنوارے اور ان میں کنگھی کی۔ انہیں اس سے پہلے علم تک نہ تھا کہ ان کی رخصتی کی تیاری ہو رہی ہے (۸۱/ ب) حضرت عائشہؓ کی ایک اور روایت ہے کہ ایک مرتبہ خوشی کے موقع پر حبشی باہم نیزہ بازی کا مقابلہ دکھا رہے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خواہش پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حبشیوں کا یہ کھیل اس طرح دکھایا کہ آپ آگے کھڑے ہو گئے اور حضرت عائشہؓ پیچھے کھڑی ہو کر یہ کھیل اس طرح دیکھتی رہیں کہ ان کا رخسار رسول اکرم ﷺ کے کندھے کے ساتھ تھا (۸۱/ ج) جس طرح گڑیوں اور کھلونوں سے حضرت عائشہ کی رغبت والی روایات سے ان کا بہت کم عمر ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح مذکورہ طرز کی روایات سے بھی ان کے بہت ہی کم عمر ہونے پر کوئی یقینی دلیل فراہم نہیں ہوتی۔ حضرت عائشہ صدیقہ علم و فضل میں دیگر سب ازواج مطہرات سے بہت بڑھ کر تھیں۔ ان سے کوئی دو ہزار سے زائد احادیث مروی ہیں۔ خلفائے راشدین کے دور میں وہ فتویٰ دیتی تھیں۔ روایات کی جانچ پڑتال میں اصولِ روایت کے ساتھ اصولِ درایت کو بھی ملحوظ رکھتی تھیں۔ بعض اوقات اکابر صحابہ کرامؓ پر بھی علمی گرفت فرماتی تھیں۔ دین میں مہارت و بصیرت کے ساتھ اعلیٰ پایہ کی شاعرہ اور ماہر انساب بھی تھیں۔ علم الانساب میں یہ مہارت یقیناً حضرت ابوبکر صدیقؓ، اپنے والد کے زیرِ سایہ ہی حاصل کی ہوگی اگر ان کی نہایت کم عمری میں رخصتی ہو گئی ہو تو وہ علم الانساب میں اپنے والد گرامی سے زیادہ استفادہ نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کا علمی تبحر ان کی عمر کی پختگی پر دلالت کرتا ہے۔ ایسے اوصافِ جلیلہ کی حامل خاتون کو گڑیوں اور کھلونوں سے بہ ذاتِ خود چنداں دل چسپی نہیں ہو سکتی اس کی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ کھلونوں کے ذریعہ چھوٹی بچیوں کے ساتھ تفریحِ طبع کا سامان بہم پہنچاتی تھیں۔ نوعمر جوان خواتین کا جھولا جھولنا یا رخصتی کے وقت کسی ماں کا ایسی کسی بیٹی کا منہ دھلانا اور زیب و زینت کرنا معمول کی بات ہے اور چنداں تعجب خیز نہیں کہ ایسی روایات سے حضرت عائشہ کی نہایت کم عمری پر استدلال کیا جائے۔

۸۔ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا کہ آؤ دوڑ میں مقابلہ کریں چونکہ اس وقت حضرت عائشہؓ دبلی پتلی تھیں اس لئے آگے نکل گئیں۔اس کے بعد ایک اور موقع پر پھر مسابقت کی نوبت آئی تو اب چونکہ ان کا وزن بڑھ گیا تھا۔اس لئے فربہی کی وجہ سے پیچھے رہ گئیں تو رسول اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ یہ اس دن کا بدلہ ہے (۸۲/ الف) عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ موٹاپا کبھی طبعی ہوتا ہے تو کبھی خوش خوراکی اور بسیار خوری اس کا سبب بنتی ہے۔ازواج مطہرات رسول اکرم ﷺ کے ساتھ روکھی پھیکی زندگی گزار رہی تھیں۔خود حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق گھر میں کئی کئی دن تک چولہا نہیں جلتا تھا صرف پانی اور چند کھجوروں پر زندگی بسر ہوتی تھی لہٰذا بسیار خوری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔حضرت عائشہؓ کا یہ موٹاپا عمر بڑھنے کے ساتھ طبعی تھا۔اگر رسول اکرم ﷺ کی وفات کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر صرف اٹھارہ سال ہوتی تو سترہ یا اٹھارہ سال کی کم خور خاتون عام حالات میں موٹاپے کا شکار نہیں ہوسکتی۔خصوصاً جب کہ اس کی اولاد بھی نہ ہو کیونکہ بچوں کی پیدائش سے بھی خواتین قدرے فربہ اندام ہوجاتی ہیں۔رسول اکرم ﷺ کی دوڑ میں یہ مسابقت امت کے بڑی عمر کے افراد کو اپنی نوعمر بیویوں کے ساتھ حسنِ معاشرت کی تعلیم دینے کے لئے ہے، تاکہ کہیں امت کے صالح بزرگ بھی غیر شعوری طور پر اپنی کم عمر بیویوں سے اس طرح کے رویے اور طرزِ عمل کو غیر اللہ سے محبت نہ سمجھنے لگیں۔

۹۔حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ہجرتِ حبشہ اور ہجرتِ مدینہ کے متعلق صحیح بخاری میں ایک طویل روایت موجود ہے جس میں انہوں نے پورے تیرہ سالہ مکی دور پر بڑا جامع تبصرہ فرمایا ہے اور حالات اس شرحِ صدر سے بیان فرمائے ہیں کہ یہ گمان کرنا مشکل ہے کہ وہ سب سنے سنائے واقعات بیان کررہی ہیں بلکہ یہ سب واقعات ان کے دیکھے بھالے معلوم ہوتے ہیں (۸۲/ ب) ہجرتِ حبشہ ۵ نبوی کا واقعہ ہے۔اس لئے وہ ان دنوں اتنی عمر کو پہنچ چکی تھیں کہ اپنے مشاہدات کو مؤثر طریقے سے بیان کرسکیں اس سے بھی ابن اسحاق اور ابن ہشام کی اس روایت کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سابق الاسلام لوگوں میں شامل ہیں اور وہ اس وقت چھوٹی عمر کی تھیں۔

۱۰۔جن احادیث وروایات کا تعلق عقائد واعمال سے ہے ان کی تو خوب چھان پھٹک کر کے اہل علم نے بہ لحاظ صحت ان کی درجہ بندی کردی۔لیکن جن روایات کا تعلق تاریخی واقعات وجزئیات سے ہے، ان میں بہر حال تحقیق کی ضرورت ہے خصوصاً وہ روایات شدید جانچ پڑتال کا تقاضا کررہی ہیں جن کا سہارا لے کر مخالفینِ اسلام رسول اکرم ﷺ اور دین اسلام پر طعنہ زنی کرتے ہیں اور وہ روایات جن پر اہل بدعت عقائد کی عمارتیں ناحق استوار کرتے ہوئے تفریق بین المسلمین کی راہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر

ہم وار کرتے ہیں۔ اب حضرات حسنینؓ کی عمروں ہی کو لے لیجئے۔ مناقب اہل بیت کے ضمن میں سنن ابن ماجہ، امام بیہقیؒ کی دلائل النبوۃ اور ابن سعد کی طبقات میں یہ روایت ملتی ہے کہ حضرت عباسؓ بن عبد المطلب کی اہلیہ حضرت ام الفضلؓ نے یہ خواب دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کا ایک ٹکڑا میری گود یا میرے گھر میں ڈالا گیا ہے۔ انہوں نے پریشان ہوکر اپنا خواب رسول اکرم ﷺ سے بیان کیا۔ اس سلسلے میں ابن ماجہ کی روایت کے متن کا متعلقہ حصہ یہ ہے

قالت ام الفضل یا رسول اللہ (۸۲/ ج)

یعنی ام الفضل نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ!

اور امام بیہقی کی روایت کے متن کا متعلقہ حصہ یہ ہے

انہا دخلت علیٰ رسول اللہ ﷺ وقالت (۸۳/ الف)

یعنی وہ (ام الفضلؓ) رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا

الغرض انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا یہ خواب بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ تو اچھا خواب ہے۔ فاطمہ کے ہاں بچہ پیدا ہوگا اور تو اسے دودھ پلائے گی اور وہ تیری گود میں رہے گا۔ ابن ماجہ کی روایت میں بعد کے متعلقہ کلمات یہ ہیں۔

فولدت حسناً او حسیناً فار ضعتہ بلبن قثم (۸۳/ ب)

حضرت فاطمہؓ نے حضرت حسنؓ یا حضرت حسینؓ کو جنم دیا تو میں نے اسے قثم کا دودھ پلایا

حضرت ام الفضلؓ یہ بتا رہی ہیں کہ میرا بیٹا قثم اور سیدہ فاطمہؓ کا بیٹا دونوں دودھ شریک بھائی ہیں۔ میں نے دونوں کو دودھ پلایا۔ راوی کو یہ شک ہے کہ حضرت ام الفضلؓ نے سیدہ فاطمہؓ کے صاحب زادے حضرت حسنؓ کا نام لیا تھا یا حضرت حسینؓ کا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباسؓ کی اہلیہ ام الفضل کا اصل نام لبابہؓ بنت الحارث ہے۔ حضرت عباسؓ سے ان کے بڑے صاحب زادے کا نام فضلؓ ہے اس لئے ان کی کنیت ام الفضل ہے۔ ام المومنین حضرت میمونہ بنت الحارث ان کی حقیقی بہن ہیں۔ حضرت ام الفضل شروع ہی سے ایمان لے آئی تھیں لیکن ان کے شوہر حضرت عباسؓ نے اپنے اسلام کا کھل کر اظہار نہیں کیا تھا، اس لئے فتح مکہ سے پہلے مدینے کی جانب ہجرت نہ کرسکیں۔ سورہ نساء میں ان لوگوں کو وعید سنائی گئی ہے جو قدرت واستطاعت کے باوجود ہجرت نہ کریں، لیکن کم زور مردوں، عورتوں اور بچوں کو اس وعید سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے جو ہجرت نہ کرسکتے ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی انہی ام الفضلؓ کے بطن سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں اور میری ماں بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنہیں ہجرت نہ کر سکنے پر قرآنی وعید سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا (۸۳/ ج) فتح مکہ کے بعد غزوہ حنین و اوطاس ہوا پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۃ الجعرانہ فرمایا اور ان سب کاموں سے فراغت کے بعد مدینے میں آپ کی مراجعت اواخر ذی قعدہ ۸ ہجری (قمریہ شمسی) میں ہوئی لہٰذا محالہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ حضرت حسینؓ کی ولادتِ مبارکہ ۹ ہجری میں ہوئی اور حضرت حسنؓ کی ولادت باسعادت ۷ ہجری کی ہوسکتی ہے۔ حالانکہ اکثر اہل سیر نے حضرت حسنؓ کی ولادت کا سال ۳ ہجری اور حضرت حسینؓ کا ۴ ہجری لکھا ہے۔ سنن ابن ماجہ مطبوعہ اصح المطابع دہلی کے متعلقہ متن کے حاشیے میں اس روایت پر شاہ عبدالغنی دہلویؒ کا تبصرہ یوں ہے

قولہ قثم هو ابن عباسؓ" و ام الفضل زوجته لكن يشكل عليه ان قدوم ابن عباس و ام الفضل على النبی ﷺ سنة الفتح وهی سنة ثمانية من الهجرة وذالك الزمان كان الحسن و الحسين فطيمان لان ولادة الحسن فی السنة الثالثة وولادة الحسين فی الرابعة غاية مافی الباب لوصح رواية قتادة علىٰ حسب ماذكر ابن الاثير فی اسدالغابة ان ولادته ای الحسين سنة ست وخمسة اشهر ونصف فعلىٰ هذا ولادته فی رجب سنة السابع من الهجرة وقدوم ام الفضل فی رمضان فی التاسع فعلىٰ هذا يكون بين الولادة والقدوم سنتان وشهران فينطبق علىٰ مذهب ابی حنيفة بان الرضاع ثلاثين شهراً والله اعلم (۸۴/الف)

یعنی راوی کا قول قثم تو وہ (قثم) حضرت عباسؓ کا بیٹا ہے اور ام الفضلؓ حضرت عباسؓ کی اہلیہ ہیں لیکن اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عباسؓ کے (اس) بیٹے اور ام الفضلؓ کی نبی ﷺ کے پاس آمد فتح مکہ کے سال ۸ ہجری میں (فتح مکہ کے دنوں میں) ہوئی اور اس وقت تو حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دونوں کا دودھ چھڑایا جاچکا تھا کیونکہ حضرت حسنؓ کی ولادت ۳ ہجری اور حضرت حسینؓ کی ۴ ہجری کی ہے تو یہاں یہی بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر قتادہ کی وہ روایت صحیح ہے جو ابن اثیر نے (اپنی کتاب) اُسد الغابۃ میں لکھی ہے کہ حضرت حسینؓ کی ولادت چھ سال اور ساڑھے پانچ ماہ گزرنے پر ہوئی تھی تو (اس حساب سے) ان کی ولادت رجب ۷ ہجری کی ہوتی ہے اور ام الفضلؓ کی (مدینے میں) آمد رمضان ۹ ہجری میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے (حضرت حسین کی) ولادت اور (ام الفضل کے مدینے میں) آمد کے درمیان دو سال اور دو

مہینے کی مدت بنتی ہے تو (یہ صورتِ حال) امام ابوحنیفہؒ کے مذہب پر منطبق ہوتی ہے کہ بچے کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے (اڑھائی سال) ہوتی ہے واللہ اعلم از انجاح الحاجۃ شاہ عبدالغنی دہلویؒ۔

شاہ عبدالغنی دہلویؒ کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام الفضلؓ نے اپنے خواب کی تعبیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قاصد وغیرہ کے ذریعے پوچھی ہوگی کیونکہ وہ خود تو بہ قول ان کے رمضان ۹ ہجری سے پہلے مدینے میں نہیں آئیں اور یہ کہ بہ مطابق روایت قتادہؒ حضرت حسین کی ولادت رجب ۷ ہجری کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔ لیکن ابن ماجہ اور دلائل النبوۃ میں مذکور روایت کے متن سے اس کی تائید نہیں ہوتی کیونکہ اس سے صاف واضح ہو رہا ہے کہ حضرت ام الفضلؓ نے اپنے خواب کی تعبیر رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں خود حاضر ہو کر دریافت کی تھی، پس بہ مطابق روایت حضرت حسینؓ کی ولادت ۹ ہجری اور حضرت حسنؓ کی ولادت ۷ ہجری سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ امامیہ عالم ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ حضرت حسنؓ جب سات روز کے ہوئے تو آں حضرت ﷺ نے دو ابلق گوسفند عقیقے میں ذبح کئے اور اسماءؓ بنت عُمیس دایہ کو ایک ران اور ایک اشرفی عطا فرمائی اور امام حسینؓ کے سر کے بال کٹوا کر برابر چاندی کے تصدق کروائے اور امام حسنؓ کے سر مبارک پر خلوق کہ ایک قسم کی خوشبو ہے لگائی اور فرمایا اے اسماء خونِ عقیقہ بچے کے سر پر ملنا (۸۴/ب) حضرت اسماءؓ بنت عمیس حضرت جعفر طیارؓ بن ابی طالب کی اہلیہ ہیں۔ حضرت جعفر طیارؓ، سیدنا حضرت علیؓ کے بھائی ہیں۔ انہوں نے شروع ہی سے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بعد میں وہ اپنی اہلیہ حضرت اسماءؓ بنت عمیس کے ہم راہ حبشہ ہجرت کر گئے تھے اور دونوں میاں بیوی کی وہاں سے مراجعت باتفاق مؤرخین ایام خیبر میں ہوئی تھی۔ غزوہ خیبر محرم ۷ ہجری (قمریہ شمسی) بہ مطابق جمادی الاولیٰ ۷ ہجری قمری بہ مطابق ستمبر ۶۲۸ء کا واقعہ ہے۔ پس ملا باقر مجلسی کی روایت کی رو سے حضرت حسنؓ کی پیدائش ۷ ہجری سے پہلے کسی صورت میں ممکن نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حضرات حسنینؓ کی بہنیں حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ عمر میں اپنے دونوں بھائیوں سے بڑی تھیں۔ ملا باقر مجلسی نے ایک اور مقام پر لکھا ہے ''..... یہ سن کر جناب فاطمہؓ کو نہایت صدمہ ہوا اور متفکر و متردد ہو گئیں۔ یہاں تک کہ رو گئی۔ جب رات ہوئی امام حسنؓ کو دائیں اور امام حسینؓ کو بائیں کاندھے پر اٹھایا اور بایاں ہاتھ ام کلثومؓ کا اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنے پدر بزرگوار کے گھر تشریف لے گئیں..... واپسی پر جناب رسول اللہ ﷺ نے امام حسنؓ کو اور فاطمہؓ نے امام حسینؓ کو اٹھایا اور ام کلثومؓ کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے مسجد میں تشریف لائے''۔ (۸۴/ج) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام کلثومؓ اپنے دونوں بھائیوں سے عمر میں بڑی تھیں تب ہی تو انہیں پیدل چلایا گیا اور حضرات حسنینؓ کو کندھوں پر اٹھایا گیا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں

جب ان حضرت ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عمرؓ سے ہوا تو وہ کسی بھی صورت میں تیرہ چودہ سال سے کم عمر کی نہیں ہوسکتیں۔

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ عصر کی نماز پڑھ کر باہر نکلے تو حضرت حسنؓ کو بچوں کے ساتھ کھیلتے پایا تو آپ نے انہیں اپنے کندھے پر اٹھالیا اور فرمایا کہ میرے ماں باپ قربان، یہ تو نبی کریم ﷺ کے مشابہ ہے، علیؓ کے مشابہ نہیں اور حضرت علیؓ ہنس رہے تھے (۸۵/ الف) تین چار سال کی عمر کے بچے کو ہی کندھے پر اٹھایا جاتا ہے۔ اگر حضرت حسنؓ رمضان ۳ ہجری میں پیدا ہوئے ہوں تو رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے وقت ان کی عمر سات سال سے چند ماہ اوپر بنے گی اور اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں مذکورہ واقعہ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے جلد ہی بعد پیش آیا ہو تو جمہور مؤرخین کی روایت کے مطابق حضرت حسنؓ اپنی عمر کے آٹھویں سال میں ہوں گے اور اگر کچھ مدت کے بعد مثلاً اگلے یا اس سے بھی اگلے سال پیش آیا ہو تو وہ اپنی عمر کے نویں یا دسویں سال میں ہوں گے، اگر ایسا ہوتا تو حضرت علیؓ انہیں اپنے ساتھ مسجد نبوی میں نماز کے لئے لے کر جاتے نہ کہ وہ گلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہوتے نیز اس عمر کے بچے کو عموماً کندھے پر اٹھایا نہیں جاتا البتہ اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ واقعہ دور نبوی کا ہو تو اشکال وارد نہیں ہوتا۔

بعض روایات کے مطابق اپنے دورِ خلافت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت حسنؓ نے کہا کہ میرے باپ کے منبر سے اتریئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا اس نے میرے کہنے سے نہیں کہا، یعنی یہ بات حضرت حسنؓ نے اپنے بچپنے کی معصومیت کی بنا پر کہی ہے (۸۵/ ب) سات آٹھ سال اور اس سے زائد عمر کا بچہ عموماً اتنا سمجھ دار ضرور ہو جاتا ہے کہ وہ اس طرح کا کام نہیں کرتا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دور صدیقی میں حضرت حسنؓ تین چار سال سے زیادہ عمر کے نہیں تھے۔ حضرت حسنؓ نے رسول اکرم ﷺ کا حلیہ مبارک اپنے ماموں حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ سے پوچھا تھا جو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے پہلے شوہر ابوہالہ کے بیٹے تھے (۸۵/ ج) اس سے بھی رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے وقت حضرت حسنؓ کا بہت کم سن ہونا ظاہر ہوتا ہے ورنہ آٹھ نو سال کا بچہ اپنے عزیزوں اور بزرگوں کے خدّ و خال اور حلیے کو اپنے حافظے میں محفوظ رکھتا ہے۔ اگر اہل علم صحیح بخاری اور سنن ابن ماجہ وغیرہ کی روایات کو نظر انداز کر کے حضرات حسنینؓ کی عمروں کے متعلق عموماً اہل سیر و مغازی کے اقوال کو قبول کرتے ہیں تو کیوں نہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر کے متعلق ابن اسحاق اور ابن ہشام کے قول کو بھی کچھ وزن دیا جائے؟

۱۱۔ دور جاہلیت میں حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا مشرکین عرب کے ہاں بہ روایت ابن عباسؓ بدترین

گناہ سمجھا جاتا تھا (۸۶/ الف) عمرے کے لئے انہوں نے اپنی قمریہ شمسی تقویم کا مہینہ رجب مخصوص کر رکھا تھا جو عیسوی مہینے مارچ/ اپریل کے مقابل ہوا کرتا تھا۔ رسول اکرم سال ۶ ہجری قمری میں یکم ذی قعدہ کو بروز سوم وار کوئی چودہ سو اصحابؓ کے ہمراہ مدینے سے مکہ کی جانب عمرے کے ارادے سے عازم سفر ہوئے۔ آپ قریش مکہ سے ہرگز جنگ نہیں چاہتے تھے حالانکہ حج کے مہینوں میں عمرے کو قریش مکہ سنگین گناہ خیال کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قریش مکہ کی تقویم قمریہ شمسی تھی، قمری نہ تھی۔ یکم ذی قعدہ ۶ ہجری بروز سوم وار عیسوی تاریخ ۱۴ مارچ ۶۲۸ء تھی۔ یہودیوں کی عبرانی تقویم کی طرز پر عربوں کی قمریہ شمسی تقویم کے پہلے مہینے محرم کا آغاز ستمبر سے ہوا کرتا تھا۔ ابوریحان البیرونی مشہور مسلم ریاضی دان کے بہ قول ہجرت نبوی سے کوئی دو سو برس پہلے سے قریش مکہ اور دیگر قبائل نے اپنی خالص قمری تقویم کو یہودیوں کی قمریہ شمسی تقویم سے ہم آہنگ کر دیا تھا تاکہ قمری مہینے موسموں کے مطابق رہیں اور حج موسم گرما میں ان دنوں میں مخصوص و متعین ہو جائے کہ ان کی کھجوروں اور مویشیوں وغیرہ کی تجارت میں خلل پیدا نہ ہو (۸۶/ ب) یوں یہودیوں کی قمریہ شمسی تقویم کے پہلے مہینے تشری کی پہلی تاریخ کو عربوں کی قمریہ شمسی تقویم کے پہلے مہینے محرم کی بھی پہلی تاریخ ہوا کرتی تھی ان دنوں بہ قول البیرونی یہودیوں کی یکم تشری سن سکندری کی ۲۷ آب اور ۲۴ ایلول کے درمیان واقع ہوا کرتی تھی۔ البیرونی نے سن سکندری کے بارہ مہینوں کے جو نام دیئے ہیں ان میں آب گیارہواں اور ایلول بارہواں مہینہ ہے (۸۶/ ج) سن سکندری کا پہلا مہینہ تشرین کہلاتا تھا جو ہمیشہ عیسوی مہینے اکتوبر کے مقابل ہوا کرتا تھا (۸۷/ الف) پس سن سکندری کے آب اور ایلول کے مہینے بالترتیب اگست اور ستمبر کے مقابل ہوا کرتے تھے یعنی عبرانی تشری اور عربوں کے محرم کی پہلی تاریخ ۲۷ اگست سے ۲۴ ستمبر کی تواریخ کے درمیان واقع ہوا کرتی تھی بالفاظ دیگر محرم قمریہ شمسی کا بڑا حصہ ستمبر کے مقابل ہوا کرتا تھا۔ اگر محرم کو ستمبر کے مقابل رکھا جائے تو قریش مکہ اور دیگر قبائل عرب کا عمرے کا قمریہ شمسی رجب، مارچ کے مقابل برآمد ہوتا ہے۔ اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اکرم ﷺ ذی قعدہ ۶ ہجری قمری بہ مطابق رجب ۶ ہجری قمریہ شمسی میں عمرے کے لئے روانہ ہوئے تھے، اس لئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ قول بالکل درست ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے ایک عمرے کا مہینہ رجب تھا لیکن حضرت عائشہؓ نے اس کی سختی سے تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ ابوعبدالرحمٰن (عبداللہ بن عمرؓ) کو معاف فرمائے۔ میں رسول اللہ ﷺ کے تمام عمروں میں موجود تھی آپ نے کبھی رجب میں عمرہ نہیں فرمایا (۸۷/ ب) دیکھئے حضرت عائشہؓ یہاں دو تقویمی التباس کا شکار ہوئیں اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی دو تقویمی الجھاؤ میں مبتلا نظر آتے ہیں، کیونکہ حضرت عائشہؓ نے جب ان کے قول کی تردید فرمائی تو وہ خاموش

رہے۔ مدینہ کے لوگوں کی تقویم قمری تھی۔ سیرت طیبہ کے بہت سے واقعات کی توقیت قمریہ شمسی تقویم میں اور متعدد واقعات کی قمری تقویم میں اور کچھ واقعات کی قمریہ شمسی اور قمری دونوں تقویموں میں ہوئی، مثلاً غزوہ خیبر واقدی اور ابن سعد کے نزدیک جمادی الاولیٰ ۷ ہجری کا اور ابن ہشام اور ابن حبیب بغدادی وغیرہ کے نزدیک محرم ۷ ہجری کا واقعہ ہے (۸۷/ج) یہاں جمادی الاولیٰ ۷ ہجری خالص قمری تقویم کا اور محرم ۷ ہجری قمریہ شمسی تقویم کا ہے۔ ہر دو تقاویم (تقویموں کو اپنی ماہیت میں ایک دوسرے سے یک سر مختلف ہیں لیکن دونوں تقاویم میں مہینوں کے نام یک ساں تھے اسی لئے یہ دو تقویمی التباس پیدا ہوا۔ عمرۃ الحدیبیہ کی توقیت اہلِ سیر نے خالص قمری تقویم میں کی ہے لیکن قمریہ شمسی تقویم کے اعتبار سے مہینہ واقعی رجب ہی کا تھا۔ اگر حضرت عائشہ صدیقہؓ مہینوں کے شمار میں قمری اور قمریہ شمسی تقویم میں امتیاز نہ کرسکیں تو اپنی عمر کے سلسلے میں بھی وہ سال شماری میں خطا کا شکار ہوسکتی ہیں۔ سال ۶ ہجری میں صلح نامہ حدیبیہ کی شرائط کی بنا پر عمرہ نہ کیا جاسکا۔ اگلے سال رسول اللہ ﷺ اور اصحابؓ نے ذی قعدہ ۷ ہجری میں عمرہ ادا فرمایا جسے عمرۃ القضاء کہا جاتا ہے۔ چونکہ سال ۷ ہجری قمریہ شمسی ان سالوں میں شامل تھا جن میں کبیسہ یا نسی کا ایک مہینہ بڑھا کر سال بارہ کی بہ جائے تیرہ مہینوں کا کیا جاتا تھا اس لئے عمرۃ القضاء کا ذی قعدہ ۷ ہجری قمری اب جمادی الاخریٰ ۷ ہجری قمریہ شمسی کے مقابل آگیا تھا۔ فتح مکہ اور غزوہ حنین و اوطاس کے بعد رسول اکرم ﷺ نے رات کی تاریکی میں جعرانہ کے مقام سے عمرہ کیا جسے عمرۃ الجعرانہ کہا جاتا ہے اس عمرے کا حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے حضرات کو بھی علم نہ ہوسکا۔ آپ نے یہ عمرہ رات کی تاریکی میں خفیہ اس لئے کیا کہ اس عمرے کا مہینہ ذی قعدہ ۸ ہجری، قمری تقویم کا نہیں بلکہ قمریہ شمسی تقویم کا تھا۔ مکہ کے لوگوں کی یہی تقویم تھی اور قبل ازیں مذکور ہو چکا ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کو عرب سخت معیوب اور بدترین گناہ سمجھتے تھے۔ چونکہ قریشِ مکہ نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا اس لئے رسول اکرم ﷺ نے مناسب نہ سمجھا کہ انہیں علانیہ عمرے کے ذریعے پریشان کیا جائے۔ عمرۃ الجعرانہ کے قمریہ شمسی ذی الحج میں ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس سے پہلے غزوہ حنین شوال ۸ ہجری میں ہوا تھا۔ شوال ۸ ہجری کو اگر خالص قمری تقویم کا لیا جائے تو عیسوی مہینہ جنوری ۶۳۰ عیسوی کا بنتا ہے حالانکہ یہ غزوہ شدید گرمی کے موسم میں ہوا تھا چنانچہ ابن سعد نے بہ روایت عبدالرحمٰن الفہری لکھا ہے

فیسرنا فی یوم قائظ شدید الحر فنزلنا تحت ظلال الشجر (۸۸/الف)

ہم (غزوہ حنین کے لئے) شدید گرم موسم میں سخت گرم دن میں چلے تو (گرمی کی شدت کی وجہ سے) ہم درختوں کے سایوں کے نیچے اترے۔

قمریہ شمسی تقویم میں رمضان کا بڑا حصہ مئی کے اور شوال کا بڑا حصہ جون کے مقابل ہوا کرتا تھا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر عربوں کی اس غلط رسم کا استیصال کیا گیا کہ حج کے مہینے میں عمرہ نہیں کیا جاسکتا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے صرف حج ہی کی نیت فرمائی تھی پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے ساتھ عمرے کو بھی شامل فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ متعلقہ روایات میں بعض میں حجۃ الوداع کو حجِ افراد کا اور بعض میں حج قِران کا نام دیا گیا ہے (۸۸/ ب) آپ کے عمروں کی یہاں تقابلی جدول پیش کی جاتی ہے:

نام عمرہ	قمری ہجری	قمریہ شمسی ہجری	عیسوی جیولین
عمرۃ الحدیبیہ	ذی قعدہ ۶ ہجری	رجب ۶ ہجری	مارچ/اپریل ۶۲۸ء
عمرۃ القضاء	ذی قعدہ ۷ ہجری	جمادی الاخریٰ ۷ ہجری	مارچ ۶۲۹ء
عمرۃ الجعرانہ	ربیع الثانی ۹ ہجری	ذی قعدہ ۸ ہجری	جولائی/اگست ۶۳۰ء
عمرہ حجۃ الوداع	ذی الحجہ ۱۰ ہجری	رسم نسی منسوخ	مارچ ۶۳۲ء

مذکورہ جدول سے معلوم ہورہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے کل دو عمرے ذی قعدہ قمری میں ہوئے بہ شرطے کہ عمرۃ الحدیبیہ کو بھی شمار میں لایا جائے کیونکہ اس سال عمرہ نہیں ہوسکا تھا اگلے سال عمرۃ القضاء ہوا عمرۃ الجعرانہ کا ذی قعدہ ۸ ہجری قمری تقویم کا نہیں بلکہ قمریہ شمسی تقویم کا ہے اور عمرہ حجۃ الوداع ذی قعدہ ۱۰ ہجری میں نہیں بلکہ ذی الحجہ ۱۰ ہجری میں ہوا تھا کیونکہ رسول اکرم ﷺ سفر حج میں اوائل ذی الحجہ ۱۰ ہجری میں مکہ مکرمہ پہنچے تھے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ کی یہ روایت صحیح نہیں کہ آپ نے حجۃ الوداع سے پہلے تینوں عمرے ذی قعدہ میں فرمائے تھے (۸۸/ ج) ان میں عمرۃ الجعرانہ کا ذی قعدہ قمری تقویم کا نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر حضرت انسؓ نے بھی یہاں قمری اور قمریہ شمسی تقویم کے ذی قعدہ میں امتیاز نہیں کیا ہے۔ لہٰذا صحابہ کرامؓ سے سال شماری میں بھی خطا کے امکان کو یکسر رد نہیں کیا جاسکتا۔

۱۲۔ رمضان المبارک کے روزے ۲ ہجری میں فرض ہوئے۔ گو بعد میں صورتِ حال بہ تدریج بہتر ہوتی چلی گئی لیکن احادیث سے ثابت ہے کہ ۲ ہجری تک عام لوگوں کو قمری مہینوں کے ایام کو شمار میں لانے میں بھی دقت کا سامنا تھا۔ قمری مہینہ ۲۹ یا ۳۰ دن کا ہوتا ہے۔ رمضان کے روزوں کی تعداد بیان کرتے ہوئے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہم ناخواندہ لوگ ہیں نہ تو ہم لکھتے ہیں اور نہ ہی ہم حساب کرتے ہیں۔ مہینہ یوں، یوں اور یوں ہوتا ہے اور تیسری مرتبہ آپ نے اپنے ہاتھوں کا ایک انگوٹھا دبالیا (پھر دوبارہ ہاتھوں کی انگلیوں کو کھولتے ہوئے اور انہیں لوگوں کے سامنے کرتے ہوئے آپ نے فرمایا) مہینہ یوں، یوں اور یوں ہوتا ہے (اس مرتبہ آپ نے سب ہی انگلیاں کھلی رکھیں اور ظاہر فرمایا کہ مہینہ ۲۹ یا ۳۰

دن کا ہوتا ہے) (۸۹/ الف) لوگ چاند کی گھٹنے اور بڑھنے کی حالتوں سے قمری تواریخ کا اندازہ کرلیا کرتے تھے۔لیکن قمری تواریخ کا باقاعدہ حساب نہ رکھنے اور انہیں لکھ نہ رکھنے کی وجہ سے مشہور واقعات کی تاریخوں میں بھی اختلاف واقع ہوا۔خواہ یہاں بھی غلطی تواریخ مہینے اور سال بتانے والوں سے ہوئی ہو یا سننے والوں کو غلطی لگی ہو اور وہ وہم کا شکار ہوئے ہوں۔مثلاً صحیح بخاری میں بہ روایت حضرت انسؓ ہجرت مدینہ کے موقع پر قبا میں رسول اکرم ﷺ کا قیام چوبیس دن رہا (۸۹/ ب) اور حضرت انسؓ ہی کی دوسری روایت کے مطابق یہ قیام چودہ دن کا تھا (۸۹/ ج) ظاہر ہے کہ یہ دونوں روایات بہ یک وقت درست نہیں ہوسکتیں۔یہاں چوبیس دن والی روایت میں کسی راوی کو وہم ہو رہا ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت کے مطابق یہ قیام دس دن سے کچھ زائد رہا (۹۰/ الف) ادھر اہل سیر ومغازی نے قبا میں قیام کی مدت سوم وار سے جمعرات تک کل چار دن کی بیان کی ہے (۹۰/ ب) قبا میں سوموار کو پہنچنے پر سب ہی کا اتفاق ہے اور حاکمؒ کہتے ہیں کہ غار ثور سے رسول اکرم ﷺ کی مدینے کو روانگی سوموار کے دن ہوئی اور سوم وار ہی کو آپ قبا میں پہنچے اور اس سلسلے میں روایات متواتر ہیں (۹۰/ ج) قبا سے مدینہ کو روانگی جمعہ کے دن ہوئی تھی اور آپ نے یہ جمعہ محلہ بنی سالم میں پڑھایا تھا۔مدینہ منورہ میں رسول اکرم ﷺ کی اجازت سے حضرت اسعد بن زرارہؓ نے جمعہ کی نماز کا اہتمام پہلے ہی سے شروع کر رکھا تھا لیکن ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں رسول اکرم ﷺ کی زیر امامت سب سے پہلا جمعہ محلہ بنی سالم میں پڑھا گیا کیونکہ مکی دور میں قریش مکہ کی مخالفت کی وجہ سے مکہ میں جمعہ کا قیام ممکن نہ تھا۔محلہ بنی سالم میں رسول اکرم ﷺ کے جمعہ پڑھانے کو اولیں جمعہ تب ہی قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ قبا میں آپ کا قیام چار دن کا تسلیم کیا جائے اگر یہ قیام چودہ دن کا ہوتا تو آپ اولین جمعہ قبا ہی میں پڑھاتے۔قبا میں چودہ دن کے قیام کی حضرت انسؓ والی روایت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا غار ثور میں قیام تین دن رہا۔پھر وہاں سے سوم وار کو روانہ ہوئے۔سات دن سفر میں لگے اور آٹھویں دن سوموار ہی کو آپ قبا میں پہنچ گئے۔قبا میں سوموار سے جمعرات تک چار دن قیام رہا یوں کل مدت (۳+۷+۴)=۱۴ دن ہوئی اور پندرہویں روز آپ قبا سے چل دیئے اور مدینے میں آپ کا اولیں جمعہ محلہ بنی سالم میں ہوا۔حضرت انسؓ نے غالباً یہ فرمایا ہوگا کہ قبا میں رسول اکرم ﷺ کا قیام چودھویں رات تک رہا یعنی غار ثور میں قیام سے قبا میں قیام تک کی مدت چودہ دن تھی لیکن غلطی سے یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ پوری مدت صرف قبا میں قیام کی ہے۔دیکھئے اگر دنوں کے شمار اور حساب میں غلطی ہوسکتی ہے، اگر قمریہ شمسی اور قمری تقویم کے مہینوں میں امتیاز نہ کرنے کی غلطی ہوسکتی ہے تو سالوں کے شمار میں بھی غلطی ممکن ہے۔

۱۳۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی ولادت کے ممکنہ سالوں کو اوپر نکتہ نمبر ۱۰ میں زیر بحث لایا جا چکا ہے کہ صحیح بخاری اور سنن ابن ماجہ وغیرہ کی بعض روایات سے معلوم ہو رہا ہے اور شیعہ عالم ملا باقر مجلسی کے بعض اعترافات سے بھی اس کی تائید ہو رہی ہے کہ حضرت حسنؓ ۷ ہجری میں اور حضرت حسینؓ ۹ ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔ ادھر ازواج مطہرات کے سلسلے میں سورہ احزاب کی آیت تطہیر کا مضمون یہ ہے کہ اے (رسول کے) اہل بیت! اللہ تمہاری خوب تطہیر یعنی تمہیں گناہوں سے پاک صاف رکھنا چاہتا ہے۔ سنن ترمذی کی ایک روایت کے مطابق آیتِ تطہیر ام المومنین حضرت امّ سلمہؓ کے گھر میں نازل ہوئی تو رسول اکرم ﷺ نے حضرات حسنینؓ، حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو بلایا ان پر چادر ڈالی اور فرمایا کہ اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں ان سے (گناہوں کی) غلاظت کو دور رکھ اور ان کی خوب تطہیر فرما (۹۱/ الف) اسی لئے ان حضرات کو اصحاب الکساء (چادر والے) کہا جاتا ہے۔ حضرت ام سلمہؓ نے بھی چادر میں داخل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔ انك علىٰ خير یعنی تو (پہلے ہی) بھلائی پر ہے (کہ تو پہلے ہی اہلِ بیت میں شامل ہے) (۹۱/ ب) اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت ام سلمہؓ سے فرمایا کہ تو اور (تیرے پہلے خاوند سے پیدا ہونے) تیری بیٹی زینب بنت ابی سلمہ بھی اہل بیت میں داخل ہیں۔ (۹۱/ ج) سورۂ احزاب کا نزول غزوہ احزاب کے سال ۵ ہجری کا ہے۔ ان حالات میں یہاں زبردست اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس وقت تک حضرت حسنینؓ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے تو ان پر چادر ڈالنے والی بات کیسے درست ہو سکتی ہے؟ نیز آپ نے اپنے گھر میں مقیم اپنی بڑی صاحب زادی حضرت زینبؓ اور ان کے بچوں حضرت علی زینبیؓ اور حضرت امامہؓ کو کیوں نہ چادر میں جگہ دی؟ یاد رہے کہ حضرت زینبؓ کے شوہر ابوالعاص نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا اور غزوہ بدر میں وہ جنگی قیدیوں میں شامل تھے۔ ان سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ مکہ پہنچ کر حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیں گے یوں حضرت زینبؓ مدینہ منورہ میں رسول اکرم اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں مقیم رہیں اور آپ حضرت زینبؓ کے بطن سے پیدا ہونے والے اپنے نواسے علی زینبیؓ اور نواسی حضرت امامہؓ سے بے حد شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ نیز یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ زوجہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کو اور ان کے شوہر حضرت عثمانؓ کو کیوں نہ چادر میں داخل فرمایا؟ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آیت تطہیر کا پہلا یا اس کا مکرر نزول ۹ ہجری میں ہوا ہو تو یہ اشکال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت ماریہ قبطیہؓ اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والے اپنے عزیز ترین صاحب زادے حضرت ابراہیمؓ پر یہ چادر کیوں نہ ڈالی؟ اس سے روز روشن کی طرح واضح ہو رہا ہے کہ کتبِ سیر و حدیث میں موجود بعض تاریخی جزئیات

شدید تنقید اور عمیق تحقیق کی تا حال محتاج ہیں جس کے لئے اہل علم کو انفرادی و اجتماعی مساعی، ہر طرح کی گروہ بندی سے بالاتر ہو کر خلوص اور نیک نیتی سے بروئے کار لانی چاہئیں۔ یہاں ہمارا ناقص خیال یہ ہے کہ حضرت حسنؓ ۷ ہجری میں اور حضرت حسینؓ ۹ ہجری میں پیدا ہوئے اور ابن اثیر نے اُسد الغابہ میں بہ روایت قتادہ حضرت حسینؓ کی ولادت کا سال جو ۷ ہجری لکھا ہے وہ دراصل حضرت حسنؓ کا سال ولادت ہے۔ سیدہ فاطمہؓ کی بیٹیاں حضرت ام کلثومؓ اور حضرت زینبؓ اپنے بھائیوں سے بڑی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت حضرت حسنؓ کی عمر تین سال تھی۔ کتب حدیث میں حضرت حسنؓ کی ایک روایت ملتی ہے کہ مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز وتر میں پڑھنے کے لئے کلمات یعنی دعائے قنوت سکھائی تھی۔ (۹۲/ الف) اس سے تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ راقم الحروف (ظفر احمد) کے بڑے بیٹے کی پیدائش جولائی ۱۹۶۲ عیسوی کی ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ عیسوی میں پاک بھارت جنگ ہوئی تھی۔ اس کے متعلق گھر میں جو باتیں ہوا کرتی تھیں ان میں سے کئی ایک اسے بہ خوبی یاد ہیں۔ تو ہمیں ذاتی تجربے اور مشاہدے سے معلوم ہوا کہ تین سال کی عمر کا بچہ بھی بعض باتوں کو اپنے حافظے میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیۂ مبارک کے دھندلے نقوش بھی حضرت حسنؓ کی یادداشت میں ہوں گے مزید اطمینان اور وضاحت کے لئے انہوں نے حضرت ہند بن ابی ہالہ سے بھی آپ کا حلیۂ مبارک دریافت کر لیا۔ جہاں تک حضرت حسینؓ کی بعض روایات کا تعلق ہے تو وہ احادیث انہوں نے اپنے والد محترم سیدنا حضرت علیؓ سے سنی ہوں گی جنہیں حضرت حسینؓ نے حضرت علیؓ کا حوالہ دیئے بغیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کر دیا، کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت حضرت حسینؓ کی عمر دو سال سے زیادہ نہیں بنتی۔ جہاں تک لفظ اہل بیت کا تعلق ہے تو اس کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے آیت تطہیر کے سیاق و سباق کی رو سے ازواج مطہرات ہی اس کا اولین مصداق ہیں۔ قرآن کریم میں اہل بیت کا لفظ بیوی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ سورہ ہود میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کی اہلیہ محترمہ کو اہل بیت کے لفظ سے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں تم پر ہوں۔ (۹۲/ ب) حضرت موسیٰؑ نے بھی اپنی بیوی کے لئے اہل کا لفظ استعمال فرمایا (۹۲/ ج) اور دونوں جگہ لفظ اہل کی مناسبت سے جمع مذکر کی ضمیریں لائی گئی ہیں، لہٰذا سورۂ احزاب کی آیت تطہیر مین جمع مذکر کی ضمیر مخاطب لانے سے اس میں کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا کہ یہاں اہل البیت سے ازواج مطہرات مراد نہیں بلکہ وہی حقیقی اہل بیت ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد بھی ضمناً اہل بیت میں شامل ہے۔

حضرت زیدؓ بن ارقم کی روایت کے مطابق آل علیؓ، آل عقیلؓ، آل جعفر طیارؓ، آل عباسؓ جن پر صدقہ

حرام ہے، سب ہی کو اہل بیت قرار دیا گیا ہے اور ایک روایت میں انہوں نے ازواج مطہرات کو اہل بیت میں شامل کیا ہے لیکن دوسری روایت میں یہ کہتے ہوئے انہیں شامل نہیں کیا کہ بیوی سے خاوند کا رشتہ نکاح سے پیدا ہوتا ہے اور اگر بیوی کو طلاق ہو جائے تو وہ خاوند کے گھر میں نہیں رہتی۔ حضرت زیدؓ بن ارقم کے کلام میں یہ تعارض حقیقی نہیں وہ دراصل ان اہل بیت کا ذکر کر رہے ہیں جن پر صدقہ حرام ہے درمیان میں کسی نے پوچھ لیا کہ بیویاں بھی اہل بیت میں داخل ہیں یا نہیں، تو انہوں نے مذکورہ جواب دیا کہ یہاں بات ان اہل بیت کی ہو رہی ہے جن سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبی رشتہ ہے۔ چونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ احزاب کی مخاطب ازواج میں سے کسی کو طلاق دے کر اپنے سے الگ نہیں فرمایا لہٰذا وہ اہل بیت میں شامل ہیں اسی لئے دوسری روایت میں حضرت زیدؓ بن ارقم نے انہیں اہل بیت میں قرار دیا۔ (۹۳/ الف) حضرت ابو طالب کی سب ہی مسلمان اولاد اہل بیت میں داخل ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ہانیؓ کو اہل بیت میں شمار فرمایا ہے (۹۳/ ب) آپ کا چچا ابو لہب عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب آپ کا اور اسلام کا بدترین دشمن تھا لیکن اس کی مسلمان اولاد بھی اہل بیت میں شامل، ہے چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت دُرّہؓ بنت ابی لہب کو اہل بیت میں شمار فرمایا۔ ان کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ اے لوگو! کیا بات ہے کہ میرے اہل کے بارے میں مجھے تکلیف پہنچائی جاتی ہے (کہ درّہ کو لوگ ابولہب کی بیٹی ہونے کا طعنہ دے کر پریشان کرتے ہیں) میری سفارش تو حاء، حکم، صدا، سھلب قبائل تک بھی پہنچے گی (۹۳/ ج) حضرت نوحؑ نے دعا فرمائی تھی:

رب اغفرلی ولوالدی ولمن دخل بیتی مومناً وللمومنین والمومنات (۹۴/ الف)

اے میرے رب! مجھے اور میرے ماں باپ اور ہر اس شخص کو جو بہ حالتِ ایمان میں میرے گھر میں داخل ہو، اور تمام مومنین و مومنات کو تو بخش دے۔

دیکھئے حضرت نوحؑ کفار کے مقابلے پر ہر اس شخص کو اپنے اہلِ بیت میں شامل فرماتے ہیں جو ایمان کی حالت میں آپ کے گھر میں داخل ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو رحمۃ اللعالمین اور شفیع المذنبین ہیں۔ آپ کی ازواج مطہرات امتِ مسلمہ کے تمام افراد کی روحانی مائیں اور رسولِ اکرم ﷺ سب ہی کے روحانی باپ ہیں اس لئے آل اور اہل بیت کے مفہوم میں درجہ بہ درجہ وسعت پائی جاتی ہے۔ ہر وہ مسلمان جو صحیح ایمان اور اعمالِ صالحہ کی نعمت سے بہرہ مند ہے وہ بھی مجازاً آلِ رسول ﷺ اور اہل بیت رسول میں داخل ہے جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے مختلف قبائل کا بہ طورِ مثال ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ میری شفاعت سے سب ہی مستفید ہوں گے۔ البتہ یہ بدیہی امر ہے کہ ازواج رسول اور اولادِ رسول

اور سب ہی اقارب رسول بہ لحاظ مراتب و مدارج اولین اہلِ بیت ہیں اور جب تمام مسلمان افراد امت کے مقابلے میں یہ الفاظ بولے جاتے ہیں تو ان سے ازواج رسول اور دیگر اقارب ہی مراد ہوتے ہیں اور کفار کے مقابلے میں پوری امت مسلمہ آل رسول اور اہل بیت رسول میں داخل ہے۔ لیکن جو ایمان اور اعمالِ صالحہ کی نعمت سے محروم ہے وہ اہل بیت میں داخل نہیں جیسے حضرت نوحؑ کے ایک حقیقی بیٹے کو اس کے کفر و نفاق کی وجہ سے اہلِ بیت سے خارج کر دیا گیا۔ سورہ احزاب میں ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں تو اے ایمان والو تم بھی اس پر صلوٰۃ و سلام بھیجا کرو (۹۴/ ب) یہاں صرف رسول اکرم ﷺ کا ذکر ہے۔ امتِ مسلمہ کے افراد کا ذکر اسی صلوٰۃ کے سلسلے میں دوسری جگہ اسی سورۃ احزاب میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ (اللہ) اور اس کے فرشتے تم (اصحابِ محمد اور دیگر افراد امت) پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے اور وہ ایمان والوں پر بہت رحم کرنے والا ہے (۹۴/ ج) صلوٰۃ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو معنیٰ رحمت نازل کرنے کا ہوتا ہے اور اگر مخلوق کی طرف اس کی نسبت ہو تو معنیٰ دعائے رحمت کرنے کا لیا جاتا ہے۔ نماز میں اور دیگر مواقع پر بھی مسلمان رسول اکرم ﷺ پر جب صلوٰۃ و سلام بھیجتے ہیں تو اس میں آپ کی آل کو بھی شامل کرتے ہیں۔ سورہ احزاب کے مذکورہ بالا مضامین سے بہ خوبی واضح ہو رہا ہے کہ یہاں آل سے پوری امتِ مسلمہ مراد ہے ورنہ یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے تو سب مسلمانوں پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں اور اللہ کا رسول (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اللہ کی اس رحمت کو صرف اپنی اولاد تک محدود رکھنا چاہتا ہے اور مسلمانوں کو بھی آپ نے اس بات کا پابند کر رکھا ہے کہ وہ آپ کی اولاد کے لئے ہی دعائے رحمت کیا کریں۔ گویا قرآن کریم میں بیان کردہ آپ کی صفت ''بالمومنین رؤف رحیم'' کہ آپ مومنین پر نہایت ہی مشفق اور مہربان ہیں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) غلط ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ جو کچھ فرماتا اور کرتا ہے رسول اکرم ﷺ کا طرزِ عمل (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اس کے بالکل برعکس ہے۔ کوئی عقل کا اندھا ہی ایسے بے ہودہ نتائج قبول کر سکتا ہے۔ جب آل کے مفہوم میں اولاد کے علاوہ متبعین کو بھی شامل کیا جائے تو کسی طرح کا اشکال وارد نہ ہوگا۔ امام راغب اصفہانی لفظ آل کے مباحث میں لکھتے ہیں کہ حضرت جعفر صادقؒ سے پوچھا گیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ سب کے سب مسلمان آلِ نبیؐ میں شامل ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ لوگ سچے بھی ہیں اور سچے نہیں بھی ہیں۔ آپ سے پوچھا گیا کہ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟ تو امام جعفر صادقؒ نے جواب دیا کہ اگر مسلمان رسول اللہ ﷺ کی شریعت کی شرائط کو قائم رکھیں یعنی شریعت پر عمل پیرا رہیں تو آل نبی میں داخل ہیں ورنہ نہیں۔ خود راغب اصفہانی نے آل کا مفہوم یوں بیان کیا ہے:

یُستعمل فیمن یختص بالانسان اختصاصاً ذاتیا اما بتوابة بقربة او موالاة

(۹۵/الف)

کسی شخص کی آل کے لفظ سے اس شخص سے خصوصی تعلق کا اظہار ہوتا ہے خواہ یہ تعلق قریبی رشتے داری کی وجہ سے ہو یا مُوالاۃ یعنی دوستی، محبت اور عقیدت کی بنا پر ہو۔

قرآن کریم میں کئی مقامات پر فرعون اور آل فرعون کا ذکر ہے یہاں آلِ فرعون سے تمام متعلقین فرعون مراد ہیں جو اس کے ہم خیال اور تابع تھے یا اس کی قوم سے تعلق رکھتے تھے گو ہم خیال نہ ہوں سورہ المؤمن میں ہے کہ آلِ فرعون سے ایک مومن نے کہا..... (۹۵/ب) صلوٰۃ ابراہیمی وغیرہ میں آل کی بہ جائے امت وغیرہ کا لفظ اس لئے نہیں لایا گیا کہ ہر شخص کو اپنی اولاد اور اعزہ واقارب سے طبعی محبت ہوتی ہے حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں لہٰذا آل کا لفظ لایا گیا جو اولاد پر خصوصاً اور درجہ بہ درجہ دیگر سب اقارب اور افرادِ امت پر عموماً دلالت کرے۔ یہی معنوی وسعت اہلِ بیت کے لفظ میں بھی ہے جیسا کہ قبل ازیں حضرت نوحؑ کی (قرآن کریم میں مذکور) دعا اور احادیث رسول سے واضح کیا جاچکا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ، حضرت امّ ہانیؓ بنت ابی طالب، حضرت دُرّہؓ بنت ابی لہب وغیرہ کو بھی اہل بیت میں شامل فرمایا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے جو سیدنا حضرت علیؓ سیدہ فاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ پر چادر ڈال کر فرمایا کہ یہ میرے اہل بیت ہیں، اس سے حصہ ہرگز مراد نہیں کہ ان کے علاوہ (معاذ اللہ) اور کوئی اہل بیت میں شامل ہی نہیں۔ غور کیجئے ازواج مطہراتؓ کے سروں پر بھی تو رسول اکرم ﷺ کی چادر ہی ہوا کرتی تھی۔ اگر کسی کو مُسلم کہا جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی سب غیر مسلم ہیں۔ اگر باپ اپنے کسی بیٹے کو لوگوں کے سامنے ''میرا پیارا بیٹا'' کہے تو ضروری نہیں کہ اس بیٹے کے علاوہ کوئی اور اس کا بیٹا ہی نہ ہو۔ رسول اکرم ﷺ نے چادر صرف انہی چار حضرات پر اس لئے ڈالی کہ بعد میں حضرت علیؓ، ان کی اولاد اور ان سے عقیدت رکھنے والوں پر خوارج نے کفر کا فتویٰ لگانا تھا۔ خوارج بہ ظاہر نہایت متقی اور عبادت گزار تھے۔ کبیرہ گناہوں کے مرتکب کو بھی وہ کافر گردانتے تھے لیکن جو مسلمان حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کو کافر نہ سمجھے وہ خوارج کی نظر میں خود کافر تھا۔ خوارج کی ظاہری پرہیزگاری کی بنا پر ان کا فتنہ بڑا سخت تھا۔ اس لئے رسول اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ، سیدہ فاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ کے بارے میں خوارج اور نواصب پر اتمامِ حجت کے لئے ان چاروں حضرات کے اہل بیت میں ہونے کے اظہار کا ہی خاص اہتمام فرمایا۔ چنانچہ حضرت حسنینؓ کی حقیقی بہنوں حضرت ام کلثومؓ اور حضرت زینبؓ کو بھی چادر میں لانے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی اور نجران کے عیسائیوں سے مباہلے کے

موقع پر بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اپنے ساتھ نہیں لے گئے کیونکہ جن لوگوں نے بعد کے زمانوں میں تقریباً سب ہی صحابہ کرامؓ کو ہدفِ طعن بنانا تھا، ان کی فکری لغزش عقل ونقل کی روشنی میں اتنی واضح اور کھلی ہے کہ قرآن وسنت کی واضح تصریحات کے بعد علیحدہ سے کسی مزید اہتمام کی ضرورت نہیں تھی۔ سورہ احزاب کی آیت تطہیر اگر ۵ ہجری میں نازل ہوئی ہو تو ضروری نہیں کہ اسی وقت یا اگلے ہی دن رسولِ اکرم ﷺ نے حضرات حسنینؓ اور ان کے والدین پر چادر ڈالی ہو جیسا کہ روایات سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے چنانچہ ذخیرۂ احادیث میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی روایت ملتی ہے کہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو رسول اکرم ﷺ نے ان چاروں حضرات کو بلا کر فرمایا کہ یہ میرے اہلِ بیت ہیں (۹۵/ ج) نجران کے عیسائیوں کو مباہلے کی دعوت بالاتفاق اواخر ۹ ہجری یا اوائل ۱۰ ہجری کا واقعہ ہے کیونکہ نجران کے عیسائیوں کا وفد غزوہ تبوک کے بعد اواخر ۹ ہجری (قمریہ شمسی) میں آیا تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ سورہ احزاب کی بعض آیات مثلاً آیت تطہیر کا نزول بھی اسی زمانے میں ہوا ہو۔ اور متعلقہ حضرات کو چادر میں داخل کرنے کا واقعہ بھی ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں انہی ایام میں پیش آیا ہو۔ سورہ احزاب میں ہے کہ محمد تم مردوں میں سے کسی کے (حقیقی اور نسبی) باپ نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں (۹۵/ د) رسول اکرم ﷺ کی مکی دور میں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے پیدا ہونے والی نرینہ اولاد مکہ مکرمہ میں ہی بچپن میں فوت ہوگئی تھی۔ آیت مذکورہ میں واضح اشارہ موجود تھا کہ مدنی دور میں آپ کی صلب سے پیدا ہونے والے حضرت ابراہیمؓ بھی زندہ نہیں رہیں گے۔ مباہلے کے لئے نکلتے وقت اگر رسول اکرم ﷺ اپنے اس صاحب زادے کو بھی ساتھ لیتے تو گویہ مباہلہ سرے سے ہوا ہی نہ تھا لیکن کسی کج فہم کو یہ وسوسہ ہوسکتا تھا کہ بعد میں ۱۰ ہجری میں حضرت ابراہیمؓ بن رسول اکرم ﷺ کی وفات شاید عیسائیوں کی یک طرفہ بددعا سے ہوئی ہو، اس لئے آپ نے انہیں اس موقع پر اپنے ساتھ نہیں لیا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر اور ضمناً دیگر متعلقات پر طویل بحث ممکن ہے بعض طبائع پر گراں گزری ہو لیکن ہم معذرت کے ساتھ یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر کا چھ یا سات سال ہونا یقیناً غلط اور سترہ سال ہونا یقیناً درست ہے۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ممکن ہے اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سات سال ہو اور ممکن ہے سترہ سال ہو جس معاملے میں امکان اور عدم امکان دونوں صورتیں مساوی ہوں بلکہ عدم امکان کی صورت بعض قوی قرائن کی بنا پر راجح نظر آرہی ہو تو ایسے ظنی امور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے اصحاب پر بدنیتی یا غلط فہمی سے طعن وتشنیع کی بلند وبالا دیواریں ناحق استوار کرنا تعصب وجہالت کا مظاہرہ ہے، نہ

کہ یہ کوئی علمی مشغلہ ہے۔ اگر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی طرف منسوب روایات میں خطا کے ہر احتمال کی نفی بھی کر دی جائے تو بھی رخصتی کے وقت ان کی عمر گیارہ سال سے کم نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی روایت مُدرک بالقیاس ہے لہٰذا اسے مرفوع حدیث کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

۱۱۔ بائبل اور قرآن کی جمع وتدوین

(الف) بائبل کی جمع و تدوین

بائبل کے لاینحل اختلافات، ناقابل تطبیق تضادات، خلاف عقل اور مضحکہ خیز مضامین، حضرات انبیاء علیہم السلام کے متعلق فحش کہانیاں، توحید رسالت اور آخرت کے صحیح تصورات کی شرم ناک اور مکروہ انداز میں پامالی یہ سب امور اس کے محرّف ہونے پر ناقابل تردید ثبوت فراہم کر رہے ہیں، چنانچہ اگر اس (جھوٹے) مفروضے کو صحیح سمجھ لیا جائے کہ بائبل کی کتب تحریف سے آلودہ نہیں تو ان کے تمام بے ہودہ مضامین کو بھی صحیح ماننا ہوگا کہ خدا اور اس کے انبیاء (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) دغابازی اور فریب دہی سے بھی کام لیتے تھے۔ ایک نبی دوسرے نبی تک کو وحی کا جھوٹا حوالہ دے کر (معاذ اللہ) دھوکہ دے لیا کرتا تھا۔ نبی اپنے دلوں کی باتوں کو جھوٹ موٹ خدا کا الہام اور کلام قرار دے کر (معاذ اللہ) لوگوں کو بے وقوف بنایا کرتے تھے وغیرہ۔ بائبل کی ان کتابوں سے اہلِ کتاب اپنا مومن ہونا ثابت نہیں کر سکتے، ان کتب سے اپنے لئے جنت کا استحقاق ثابت کرنا بھی ان کے لئے محال ہے، ان کتب میں بدترین ظلم اور دہشت گردی کی تعلیم ملتی ہے وغیرہ سب کچھ گزشتہ مضامین میں خوب واضح کیا جا چکا ہے۔ اس لئے بائبل کی تحریف پر بیرونی شہادتیں اور بائبل کے عیسائی شارحین اور مؤرخین کے اپنے اعترافات جمع کرنے کی ہم ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس پر بائبل کی اندرونی شہادتوں کا ہی ایک انبار موجود ہے جن میں بعض تاریخی شہادتیں بھی شامل ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں تورات کا صرف ایک ہی نسخہ تھا جو ان کے حکم سے صندوق شہادت میں رکھا گیا تھا۔ اس صندوق میں اسرائیلی انبیاء علیہم السلام کے تبرکات محفوظ کئے جاتے تھے۔ بائبل کے پرانے عہد نامے کی کتاب استثناء میں ہے:

''اور ایسا ہوا کہ جب موسیٰ اس شریعت کی باتوں کو ایک کتاب میں لکھ چکا اور وہ ختم ہو گئیں تو موسیٰ نے لاویوں سے جو خداوند کے عہد کے صندوق کو اٹھایا کرتے تھے کہا کہ اس شریعت کی کتاب کو لے کر خداوند اپنے خدا کے عہد کے صندوق کے پاس رکھ دو تا کہ وہ تیرے برخلاف گواہ رہے کیونکہ میں تیری بغاوت اور گردن کشی کو جانتا ہوں۔ دیکھو ابھی تو میرے جیتے جی تم خداوند سے بغاوت کرتے رہے ہو تو

میرے مرنے کے بعد کتنا زیادہ نہ کرو گے''؟ (۹۶/ الف) تورات کا یہ نسخہ ساتویں سال لوگوں کو پڑھ کر سنایا جاتا تھا چنانچہ اسی کتاب استثناء میں ہے: ''اور موسیٰؑ نے اس شریعت کو لکھ کر اسے کاہنوں (مذہبی سرداروں) کے جو بنی لاوی اور خداوند کے عہد کے صندوق کے اٹھانے والے تھے اور اسرائیل کے سب بزرگوں کے سپرد کیا۔ پھر موسیٰؑ نے ان کو یہ حکم دیا کہ ہر سات برس کے آخر میں چھٹکارے کے سال کے معیّن وقت پر عید خیام میں، جب سب اسرائیلی خداوند تیرے خدا کے حضور اسی جگہ آ کر حاضر ہوں جسے وہ خود چنے گا تو تو اس شریعت کو پڑھ کر سب اسرائیلیوں کو سنانا۔ تو سب لوگوں کو یعنی مردوں، عورتوں اور بچوں اور اپنی بستیوں کے مسافروں کو جمع کرنا تا کہ وہ سنیں اور سیکھیں اور خداوند تمہارے خدا کا خوف مانیں اور اس شریعت کی سب باتوں پر احتیاط رکھ کر عمل کریں''۔ (۹۶/ ب)

حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم بنی اسرائیل کی بغاوت و سرکشی کے متعلق جن خدشات کا اظہار فرمایا تھا وہ بعد میں سو فیصد صحیح ثابت ہوئے۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت یوشعؑ اور حضرت کالبؓ یکے بعد دیگرے ان کے جانشین ہوئے لیکن ان دونوں حضرات کے بعد بنی اسرائیل کی سیاسی اور مذہبی حالت بگڑتی چلی گئی۔ ان دنوں وہ عربوں کی طرح نیم خانہ بدوش تھے۔ اس قبائلی زندگی میں جو شخص معتبر سمجھا جاتا اور قبائلی جھگڑوں کا فیصلہ کرتا اسے قاضی کہا جاتا تھا۔ یہی اسرائیلیوں کے رہنما تھے جو فوج کے سپہ سالار بھی ہوا کرتے تھے۔ بائبل کی کتاب قضاۃ میں انہی رہنماؤں کے احوال مذکور ہیں اور اسی کتاب سے بنی اسرائیل کے مذہبی بگاڑ کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے چنانچہ اس میں لکھا ہے:

''اور وہ ساری پشت بھی اپنے باپ دادا سے جا ملی اور ان کے بعد ایک اور پشت پیدا ہوئی جو نہ خداوند کو اور نہ اس کے کام کو جو اس نے اسرائیل کے لئے کیا، جانتی تھی اور بنی اسرائیل نے خداوند کے آگے بدی کی اور بعلیم (دیو) کی پرستش کرنے لگے اور انہوں نے خداوند اپنے باپ دادا کے خدا کو جو ان کو ملک مصر سے نکال لایا تھا، چھوڑ دیا اور دوسرے معبودوں کی جو ان کے چوگرد کی قوموں کے دیوتاؤں میں سے تھے، پیروی کرنے اور ان کو سجدہ کرنے لگے اور خداوند کو غصہ دلایا اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عسارات کی پرستش کرنے لگے اور خداوند کا قہر اسرائیل پر بھڑکا اور اس نے ان کو غارت گروں کے ہاتھ میں کر دیا جو ان کو لوٹنے لگے اور اس نے ان کو ان کے دشمنوں کے ہاتھ جو آس پاس تھے بیچا۔ سو وہ پھر اپنے دشمنوں کے سامنے کھڑے نہ ہو سکے''۔ (۹۶/ ج)

قُضاۃ کا یہ دور گڈ نیوز بائبل کے توقیتی جدول کے مطابق ۱۲۰۰ قبل مسیح/ ۱۸۷۸ قبل ہجرت کا ہے جب کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کا زمانہ جس میں بنی اسرائیل مصر سے چلے آئے تھے اور انہیں

تورات دی گئی تھی، تقریباً ۱۲۵۰ سے ۱۲۱۰ قبل مسیح / ۱۹۲۹ سے ۱۸۸۸ قبل ہجرت تک کا ہے۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل کی حالت میں بہتری آئی۔ ان دونوں انبیاء علیہما السلام کا دور حکومت گڈ نیوز بائبل کے توقیتی جدول کے مطابق تقریباً ۱۰۱۰ سے ۹۳۱ قبل مسیح / ۱۶۸۲ سے ۱۶۰۱ قبل ہجرت تک کا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل متحد نہ رہ سکے۔ ان کے ایک خادم خاص یربعام نے بغاوت کر کے اسرائیل کے نام سے ایک الگ مملکت قائم کر لی جس کا دارالحکومت سامرہ تھا اور جنوب میں قائم سلطنت یہوداہ کا مرکز یروشلم تھا جس پر حضرت سلیمانؑ کے بیٹے رحبعام کی حکومت تھی۔ اسرائیل کی سلطنت اسوریوں کے ہاتھوں جلد ہی ۷۲۲ قبل مسیح / ۱۳۸۵ قبل ہجرت میں ختم ہوگئی جیسا کہ گڈ نیوز بائبل کی ملحقہ توقیتی جدول سے بھی واضح ہے۔ مملکت یہوداہ کے ایک حکمران یوسیاہ کا دور حکومت ۶۴۰ سے ۶۰۹ قبل مسیح / ۱۳۰۰ سے ۱۲۶۹ قبل ہجرت کا ہے۔ اس کی حکومت کا اٹھارہواں سال تھا کہ خلقیاہ نام کے ایک کاہن نے دعویٰ کیا کہ مجھے ہیکل (بیت المقدس) سے تورات کا نسخہ ملا ہے جو اس نے سافن بن اصلیاہ منشی کو دے دیا۔ اس نے جب تورات یوسیاہ بادشاہ کو پڑھ کر سنائی تو اس نے بنی اسرائیل کی نافرمانی کے غم میں اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے (۹۷/ الف) یوسیاہ کی حکومت کا اٹھارہواں سال ۶۲۲ قبل مسیح / ۱۲۸۲ قبل ہجرت بنتا ہے۔ یعنی اس وقت تک تورات اور ملحقہ کتب ناپید ہو چکی تھیں ورنہ ایک ہی نسخہ برآمد ہونے کا ذکر اس قدر حیرت و اہتمام سے نہ کیا جاتا اور نہ ہی اسے سن کر یوسیاہ اپنے کپڑے پھاڑتا۔ خلقیاہ کاہن کا بھی کیا اعتبار ہے کہ واقعی اسے کوئی نسخہ ملا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے بزرگوں سے سنی سنائی باتوں پر مبنی اپنی طرف سے رطب و یابس جمع کر کے خود ہی اسے مرتب کر ڈالا ہو اور پھر یہ مشہور کر دیا ہو کہ مجھے یہ نسخہ ہاتھ لگا ہے۔ بائبل کی کتاب یرمیاہ میں نبیوں اور کاہنوں کے اوصاف یوں مذکور ہیں: ''اس لئے کہ چھوٹوں سے لے کر بڑوں تک سب لالچی ہیں اور نبی سے کاہن تک ہر ایک دغاباز ہے''۔ (۹۷/ ب)

بہر حال تورات کے مذکورہ مضامین سے معلوم ہو رہا ہے کہ یوسیاہ سے پہلے ہی تورات عرصۂ دراز سے ناپید ہو چکی تھی۔ تورات کا جو نسخہ خلقیاہ کاہن کو بہ قول اس کے ہیکل سلیمانی سے ملا تھا وہ بھی تحریف سے محفوظ نہ رہ سکا کیونکہ کتاب اللہ کی حفاظت کی ذمہ داری اسرائیلی انبیاء اور کاہنوں (مذہبی سرداروں) پر تھی۔ بائبل میں نہ صرف کاہنوں کو بلکہ انبیاء کو بھی دغاباز قرار دیا گیا ہے۔ کتاب یرمیاہ میں ہے: ''..... کیونکہ یروشلم کے نبیوں ہی سے تمام ملک میں بے دینی پھیلی ہے۔ ربُّ الافواج یوں فرماتا ہے کہ ان نبیوں کی باتوں کو نہ سنو جو تم سے نبوت کرتے ہیں وہ تم کو بطالت کی تعلیم دیتے ہیں وہ اپنے دلوں کے الہام بیان کرتے ہیں نہ کہ خداوند کے منہ کی باتیں''۔ (۹۷/ ج) بہ مطابق کتاب یرمیاہ ان نبیوں نے کتاب اللہ

میں تحریف کردی تھی۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے: ''پر خداوند کی طرف سے بارِ نبوت کا ذکر تم کبھی نہ کرنا اس لئے کہ ہر ایک آدمی کی اپنی ہی باتیں اس پر بار ہوں گی کیونکہ تم نے زندہ خدا رب الافواج ہمارے خدا کے اس کلام کو بگاڑ ڈالا ہے'' (۹۸/ الف) اور اسی کتاب یرمیاہ میں ہے: ''نبی اور کاہن دونوں ناپاک ہیں۔ ہاں میں نے اپنے گھر کے اندر ان کی شرارت دیکھی ہے''۔ (۹۸/ ب)

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ کتاب یرمیاہ میں تو جھوٹے نبیوں کی بات کی جارہی ہے۔ خدا کے سچے نبی جھوٹ نہیں بولتے ہوں گے تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خود حضرت یرمیاہ بھی بائبل کی رو سے سچے قرار دیئے جاسکتے ہیں؟۔ خدا کے متعلق اسی کتاب یرمیاہ کے اس مضمون پر غور کیجئے: ..... ''کیونکہ خداوند کا قہر شدید ہم سے ٹل نہیں گیا اور خداوند فرماتا ہے کہ اس وقت یوں ہوگا کہ بادشاہ اور سردار بے دل ہوجائیں گے اور کاہن حیرت زدہ اور نبی سراسیمہ ہوں گے۔ تب میں (یرمیاہ) نے کہا افسوس اے خدا وند اخدا، یقیناً تو نے ان لوگوں اور یروشلم کو یہ کہہ کر دغا دی کہ تم سلامت رہو گے حالانکہ تلوار جان تک پہنچ گئی ہے''۔ (۹۸/ ج)

اس عبارت سے معلوم ہورہا ہے کہ خدا نے لوگوں سے اور یروشلم کے رہنے والوں سے سلامتی کا (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) جھوٹا وعدہ کرکے انہیں فریب دے رکھا تھا۔ ہمارے اہلِ کتاب بھائی خوب سوچ سمجھ کر بتائیں کہ خدا کو جھوٹا اور دغاباز قرار دینا کلمۂ کفر ہے یا (معاذ اللہ) تسبیح وتحمید کا کلمہ ہے؟ اگر یہ ان کے نزدیک خدا کی تسبیح وتحمید ہے تو اہلِ کتاب کو بھی جھوٹے اور دغاباز ہونے کے ان اوصاف کو اپنے اور اپنے مذہبی پیشواؤں کے لئے نہایت خندہ پیشانی، زندہ دلی اور فراخ دلی سے قبول کرنا چاہئے۔ اگر یہ کفر کا کلمہ ہے تو کتابِ احبار میں ہے: ''اور وہ جو خداوند کے نام پر کفر بکے ضرور جان سے مارا جائے۔ ساری جماعت اسے قطعی سنگ سار کرے خواہ وہ دیسی ہو یا پردیسی۔ جب وہ پاک نام پر کفر بکے تو وہ ضرور جان سے مارا جائے''۔ (۹۹/ الف)

کتاب یرمیاہ اور کتابِ احبار کے مذکورہ مضامین کی رو سے تو حضرت یرمیاہ بلکہ ان کفریہ مضامین کو الہامی اور مقدس قرار دینے والے سب ہی اہلِ کتاب سنگ سار کئے جانے کے لائق ٹھہرتے ہیں چہ جائے کہ حضرت یرمیاہ کو بائبل کے ان (جھوٹے) مضامین کی رو سے سچا نبی قرار دیا جائے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہورہا ہے کہ اگر کوئی دوسری قوم سب ہی اہلِ کتاب کو سنگ سار کرڈالے تو وہ کتابِ احبار کی تعلیم کی رو سے خدا کے حکم کی تعمیل کرنے والی قوم کہلائے گی نہ کہ اسے دہشت گرد قرار دیا جائے گا۔ یہ دل چسپ نتائج خود اس بائبل سے برآمد ہورہے ہیں جس کی نشر واشاعت پر ہمارے مسیحی بھائی کثیر سرمایہ اور قیمتی

وقت صرف کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے تو ہم ایک لفظ بھی نہیں کہتے۔ مزید برآں کتاب یرمیاہ میں نبیوں اور کاہنوں کی مذمت میں یہ مضمون ہے: ''ربّ الافواج یوں فرماتا ہے کہ ان نبیوں کی باتیں نہ سنو جو تم سے نبوت کرتے ہیں۔ وہ تم کو بطالت کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ اپنے دلوں کے الہام بیان کرتے ہیں نہ کہ خداوند کے منہ کی باتیں۔ وہ مجھے حقیر جاننے والوں سے کہتے رہتے ہیں خداوند نے فرمایا ہے کہ تمہاری سلامتی ہوگی اور ہر ایک سے جو دل کی سختی پر چلتا ہے کہتے ہیں کہ تجھ پر کوئی بلا نہ آئے گی''۔(۹۹/ ب)

اوپر خدا کے بارے میں حضرت یرمیاہ کا قول مذکور ہو چکا ہے کہ خدا نے لوگوں سے اور یروشلم والوں سے سلامتی کا (معاذ اللہ) جھوٹا وعدہ کر کے انہیں فریب میں ڈال رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ خدا نے ایسا وعدہ اپنے سچے نبیوں کے ذریعے ہی تو کیا ہوگا۔ یعنی (معاذ اللہ) سچے نبی بھی جھوٹے نبیوں کی طرح لوگوں سے سلامتی کے جھوٹے اور پُر فریب وعدے کیا کرتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ جھوٹے نبی یہ جھوٹ اپنی طرف سے گھڑتے تھے اور سچے نبیوں پر اس طرح کا جھوٹ (معاذ اللہ) خدا کی طرف سے بہ ذریعہ وحی اور الہام نازل ہوا کرتا تھا۔ جب سچے اور جھوٹے نبیوں کے کام کی نوعیت اور اس کے نتائج بالکل یک ساں ہیں تو سچے اور جھوٹے کے دو خانوں میں انہیں منقسم کرنا ہی قطعاً لایعنی بلکہ مضحکہ خیز ٹھہرتا ہے۔ نیز بائبل کی کتاب سلاطین اول میں ایک بڈھے نبی کے قصے سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس سچے نبی نے خدا کی وحی کا (معاذ اللہ) جھوٹا حوالہ دے کر ایک دوسرے سچے نبی کو فریب دے کر اس کی جان لے لی۔ اس نے مملکتِ یہوداہ سے بیت ایل میں آنے والے ایک دوسرے نبی کو جب وہ واپس جا رہا تھا، اپنے ہاں کھانے اور پینے کی دعوت پر بلایا لیکن اس نے کہا کہ میں نبی ہوں اور مجھے خدا نے تمہارے ہاں واپس جانے اور وہاں سے کچھ کھانے پینے سے منع کر رکھا ہے۔ اس پر بڈھے نبی نے اس سے کہا کہ میں بھی تیری طرح ایک نبی ہوں اور خدا کے حکم سے ایک فرشتے نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ گھر لے جاؤں تا کہ تو روٹی کھائے اور پانی پیے لیکن اس بڈھے نبی نے جھوٹ بولا تھا جس سے دوسرا نبی دھوکے میں آ گیا اور اس بڈھے نبی کی کھانے کی دعوت قبول کر بیٹھا۔ اس پر خدا کا کلام اس دوسرے فریب خوردہ نبی پر نازل ہوا کہ تو نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی ہے، میں نے تو تجھے بیت ایل میں واپس لوٹنے اور وہاں سے کچھ کھانے پینے سے منع کر رکھا تھا اس لئے اب تو تیری لاش بھی تیرے باپ دادا کی قبر تک پہنچنے نہیں پائے گی چنانچہ یہ نبی گدھے پر سوار ہو کر جب واپس لوٹا تو راستے میں ایک شیر نے اسے ہلاک کر دیا۔ جب (دھوکے باز) بڈھے نبی کو اس کی موت کا علم ہوا تو وہ اس مردِ خدا کی لاش کو گدھے پر ڈال کر اس پر ماتم کرنے اور دفن کرنے کو لے آیا (۹۹/ ج) اس سے معلوم ہوا کہ نبی (معاذ اللہ) جھوٹ بول کر دوسرے نبی تک کو بھی

دھوکہ دے لیا کرتے تھے اور خدا بھی بعض اوقات (معاذ اللہ) دھوکے باز نبی کو تو کوئی سزا نہیں دیتا لیکن دھوکہ کھانے والی نبی پر اس کا غصہ بھڑکتا ہے اور وہ اسے ہلاک کر دیتا ہے اور اس کی لاش تک کو اس کے باپ دادا کی قبر تک پہنچنے نہیں دیتا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بہ مطابق بائبل بڑھاپے میں بھی نبی (معاذ اللہ) جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے سے باز نہیں آتے تھے وہ اپنی جوانی کے ایام میں جو کچھ کرتے ہوں گے، اسے سمجھنا ذرا بھی مشکل نہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جب نبی دوسرے نبیوں تک کو وحی اور الہام کا جھوٹا حوالہ دے دھوکہ دے کر لیتے تھے تو عوام الناس (معاذ اللہ) ان کے فریب سے بھلا کیسے بچ نکلتے ہونگے !!!۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل کتاب کا یہ دعویٰ خود بائبل سے جھوٹا ثابت ہو رہا ہے کہ اسرائیلی انبیاء گو معصوم نہ سہی، لیکن وحی اور الہام کے بارے میں وہ معصوم ہوتے ہیں اور جھوٹ نہیں بولتے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سب ہی اہل کتاب کو خوب غور کرنے اور سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ کہیں بائبل کے مؤلفین نے جھوٹے مضامین اس میں شامل کر کے خدا کے کلام کو بگاڑ تو نہیں ڈالا، کیونکہ دھوکہ کھانے کی صورت میں بہ مطابق بائبل خدا عموماً دھوکے بازوں کو نہیں پکڑتا۔ اس کا سارا غصہ دھوکہ کھانے والوں پر ہی بھڑکتا ہے۔ اہل کتاب پھر غور فرمالیں کہ کہیں وہ ان مؤلفین کے ہاتھوں فریب خوردہ تو نہیں ہیں؟ اور جو لوگ آٹے اور گھی وغیرہ کے لالچ میں عیسائیت قبول کرتے ہیں وہ بھی سوچ لیں کہ وہ کہیں فریب کے جال میں تو نہیں پھنس گئے؟ بائبل کے مضامین کی رو سے خدا کو بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) نبیوں کو فریب دینے میں بڑی دل چسپی ہے پھر وہ ایسے فریب کھانے والے نبی کی جان کے درپے بھی ہو جاتا ہے چنانچہ کتاب حزقی ایل میں ہے: ''اور اگر نبی فریب کھا کر کچھ کہے تو میں خداوند نے اس نبی کو فریب دیا اور میں اپنا ہاتھ اس پر چلاؤں گا اور اسے اپنے اسرائیلی لوگوں میں سے نابود کر دوں گا''۔ (۱۰۰/ الف) کتاب تواریخ دوم میں ہے: ''تب ایک روح نکل کر خداوند کے سامنے کھڑی ہوئی اور کہنے لگی میں اسے (اخی اب شاہِ اسرائیل کو) بہکاؤں گی۔ خداوند نے اس سے پوچھا کس طرح؟ اس نے کہا میں جاؤں گی اور اس کے سب نبیوں کے منہ میں جھوٹ بولنے والی روح بن جاؤں گی۔ خداوند نے کہا تو اسے بہکائے گی اور غالب بھی ہوگی، جا اور ایسا ہی کر۔ سو دیکھ خداوند نے تیرے ان نبیوں کے منہ میں جھوٹ بولنے والی روح ڈالی ہے اور خداوند نے تیرے حق میں بدی کا حکم دیا ہے''۔ (۱۰۰/ ب)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) دھوکہ دینے میں پرچون کا ہی نہیں بلکہ تھوک کا کاروبار بھی کرتا ہے کیونکہ اسی کتاب تواریخ دوم میں مذکورہ مضمون کے سیاق وسباق سے معلوم ہو رہا ہے کہ جن نبیوں کے منہ میں خدا نے (معاذ اللہ) جھوٹ بولنے والی روح ڈال کر ان کے ذریعے اخی اب شاہ

اسرائیل کو دھوکہ دیا تھا، ان کی تعداد چار سو تھی (۱۰۰/ ج) خیر بات یرمیاہ نبی کی ہو رہی تھی جن کا زمانہ کوئی ۶۰۰ قبل مسیح/ ۱۲۵۹ قبل ہجرت کا ہے۔ اس کے بعد جولائی ۵۸۶ قبل مسیح/ ذی الحجہ ۱۲۴۵ قبل ہجرت میں شاہ بابل بنوکدرنضر (بخت نصر) نے یروشلم پر حملہ کر کے یہودی بادشاہ صدقیاہ کو قید کر لیا اور اس کی اولاد کو اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کیا۔ پھر اس کی آنکھیں نکلوا کر اسے زنجیروں میں جکڑ کر بابل بھجوا دیا۔ اس خون ریز اور سفاکانہ حملے میں بخت نصر نے ہیکل سلیمانی، شاہی محلات اور یروشلم کی تمام بڑی عمارتوں کو آگ لگا کر تباہ و برباد کر دیا۔ بے شمار لوگوں کو قتل کر دیا اور جو قتل ہونے سے بچ گئے انہیں قیدی بنا کر بابل لے گیا۔ اس حادثے میں تورات اور ملحقہ کتب معدوم ہو گئیں (۱۰۱/ الف) ایران کے بادشاہ سائرس نے بابل فتح کیا تو اس نے یہودیوں کو گڈ نیوز بائبل میں دی گئی توقیتی جدول کے مطابق ۵۳۸ قبل مسیح/ ۱۱۹۵ قبل ہجرت میں یہودیوں کو اپنے وطن واپس جانے کی اجازت دے دی اور یہودی قافلے یروشلم اور اس کے گردونواح میں پہنچتے رہے۔ ہیکل سلیمانی کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔ یہ یہودی قافلے مختلف ادوار میں یروشلم پہنچتے رہے۔ عزرا کاہن (حضرت عزیر) بھی آخری قافلوں میں یروشلم پہنچے اور انہوں نے تورات اور ملحقہ کتب کو از سر نو مرتب کیا اور اس کے لئے انہیں اس وقت کے دو اسرائیلی نبیوں حجیؑ اور زکریاہؑ کی اعانت حاصل تھی۔ بعد میں یہودیوں اور عیسائیوں پر جو خوف ناک حوادث پیش آتے رہے، انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ بائبل کا پرانا عہد نامہ محفوظ چلا آ رہا ہے تو اس کی گنجائش اس لئے موجود نہیں کہ بائبل کے نئے عہد نامے کی طرح پرانے عہد نامے میں خدا اور نبیوں کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) جس طرح جھوٹے اور دغاباز ظاہر کیا گیا ہے اس کے کچھ نمونے ہم اوپر پیش کر چکے ہیں اور اس میں ایسے اختلافات اور تضادات موجود ہیں، جنھیں کسی طرح دور نہیں کیا جا سکتا، مثلاً کتاب تواریخ اول میں بنیامین کی اولاد کے نام یوں مذکور ہیں۔ بنی بنیامین یہ ہیں بالع اور بکر اور یدیعیل یہ تینوں (۱۰۱/ ب) پھر اسی کتاب میں دوسرے مقام پر ان کے نام یوں لکھے ہیں۔ اور بنیامین سے اس کا پہلوٹھا بالع پیدا ہوا اور دوسرا اشبیل، تیسرا اخرخ، چوتھا نوحہ اور پانچواں رفا (۱۰۱/ ج) لیکن کتاب پیدائش میں یہ نام یوں دیئے گئے ہیں۔ اور بنی بنیمین یہ ہیں بالع اور بکر اور اشبیل اور جیرا اور نعمان، اخی اور روس، مفیم اور حفیم اور ارد (۱۰۲/ الف) اس اختلاف کے متعلق بائبل کا مفسر آدم کلارک مذکورہ پہلی عبارت کے متعلق لکھتا ہے اس جگہ اس طرح اس لئے لکھا گیا کہ مصنف کو بیٹے کی جگہ پوتے اور پوتے کی جگہ بیٹے میں امتیاز نہ ہو سکا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے اختلافات میں تطبیق دینا بے کار محض ہے۔ علمائے یہود کہتے ہیں کہ عزرا پیغمبر جو اس کتاب کے کاتب ہیں ان کو یہ پتہ نہیں تھا کہ ان میں بعض بیٹے ہیں اور بعض پوتے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ

نسب کے اوراق جن سے عزرا نے نقل کیا ہے ان میں سے اکثر ناقص تھے اور ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس قسم کے معاملات کو نظر انداز کریں''۔ (۱۰۲/ب) آدم کلارک کے اس بیان سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ حضرت عزراؑ نے تورات اور ملحقہ کتب کو صرف اپنے حافظے کے اعتماد پر لکھا یا انہوں نے ناقص اوراق کو صحیح سمجھ لیا ورنہ تواریخ اول اور کتاب پیدائش کی عبارتوں میں اختلاف نہ ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ عزرا کو دو پیغمبروں حجیؑ اور زکریاؑ کی اعانت بھی حاصل تھی لیکن پھر بھی بائبل اختلافات اور تضادات سے بھری پڑی ہے اس لئے اہلِ کتاب کا یہ دعویٰ مزید غلط ثابت ہو گیا کہ تبلیغ ووحی کے معاملے میں نبی خطا سے معصوم ہوتا ہے۔ خطا اور نسیان کو تو ایک طرف رکھئے بہ مطابق بائبل اسرائیلی انبیاء تو دوسرے نبیوں تک کو (معاذ اللہ) فریب دے لیتے تھے۔ عوام کو تو بھی وہ (معاذ اللہ) اور بھی بڑے بڑے فریب دیتے ہوں گے۔ ہم اس سلسلے میں اوپر بائبل کی کتب یرمیاہ، تواریخ دوم، سلاطین اول اور حزقی ایل کے حوالے پیش کر چکے ہیں۔ یہاں بھی اصل حقیقت یہ ہے کہ بائبل میں موجود فحش غلطیوں، اختلافات اور تضادات کی ذمہ داری حضرت عزرا اور اسرائیلی انبیاء علیہم اسلام پر ہرگز ہرگز عائد نہیں ہوتی یہ سب کچھ اہل کتاب کا اپنا کیا دھرا ہے جو ان کے سامنے آرہا ہے لیکن اپنی عادت اور فطرت سے مجبور ہو کر الزام حضرت عزراؑ پر عائد کر رہے ہیں۔

بائبل کے پرانے عہد نامے کی ابتدائی پانچ کتب تورات کہلاتی ہیں۔ تورات حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ موجودہ تورات کی ان کتب میں بعض جملے ایسے ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے والی اصل تورات ناپید ہے اور تورات کے نام سے یہ کتب حضرت موسیٰؑ سے سینکڑوں برس بعد لکھی گئی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ کتاب پیدائش میں ہے ''یہی وہ بادشاہ ہیں کہ جو ملک ادوم پر پیشتر اس سے کہ اسرائیل کا کوئی بادشاہ ہو مسلط تھے''۔ (۱۰۲/ج) اس جملے سے واضح ہو رہا ہے کہ اس کا لکھنے والا اس دور کا کوئی شخص ہے جب بنی اسرائیل کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور ان میں بادشاہت کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔ بنی اسرائیل کا سب سے پہلا بادشاہ ساؤل ہوا ہے۔ اسی ساؤل کو قرآن کریم میں طالوت کہا گیا ہے۔ یہ ساؤل اسرائیلی نبی حضرت سموئیل کے زمانے کا ہے (۱۰۳/الف) ساؤل کا دور حکومت گڈ نیوز بائبل کے آخر میں ملحق توقیتی جدول کی رو سے تقریباً ۱۰۳۰ سے ۱۰۱۰ قبل مسیح ۱۷۰۳ سے ۱۶۸۲ قبل ہجرت کا ہے جب کہ حضرت موسیٰ کا زمانہ تقریباً ۱۲۵۰ سے ۱۲۱۰ قبل مسیح/ ۱۹۲۹ء سے ۱۸۸۸ء قبل ہجرت کا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تورات کی موجودہ کتاب پیدائش حضرت موسیٰ کے سینکڑوں برس بعد لکھی گئی ہے۔

۲۔ کتاب استثناء میں ہے ''اور منسّی کے بیٹے یائیر نے جسوریوں اور معکاتیوں کی سرحد تک اور

ارجوب کے سارے ملک کو لے لیا اور اپنے نام پر بسن کے پتھروں کو حوّت یائیر (یعنی یائیر کی بستیوں) کا نام دیا جو آج تک چلا آرہا ہے''۔ (۱۰۳/ ب) یہ حضرت موسیٰؑ کا کلام ہرگز نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ باتیں لکھنے والا شخص یائیر کے بہت بعد کا ہے جیسا کہ الفاظ ''آج تک'' سے واضح ہے اور کتاب گنتی میں بھی ہے ''اور منسّی کے بیٹے یائیر نے اس نواح کی بستیوں کو جا کر لے لیا اور اس کا نام حوّت یایئر رکھا''۔ (۱۰۳/ ج) یہ بھی حضرت موسیٰؑ کا کلام نہیں ہوسکتا جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ یہاں دل چسپ بات یہ ہے کہ بہ مطابق تواریخ اول یایر مذکور منسّی کا بیٹا نہیں بلکہ شجوب کا بیٹا تھا (۱۰۴/ الف)

۳۔ کتاب گنتی میں ہے ''اور خدا نے اسرائیل کی فریاد سنی اور کنعانیوں کو ان کے حوالے کر دیا اور انہوں نے ان کو اور ان کے شہروں کو نیست کر دیا چنانچہ اس جگہ کا نام بھی حُرمہ پڑ گیا'' (۱۰۴/ ب) یہ بھی حضرت موسیٰؑ کا کلام نہیں ہوسکتا کیونکہ سب کنعانی حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں ہلاک نہیں ہوئے بلکہ ان کی وفات کے بہت بعد ہلاک ہوئے جیسا کہ کتاب قضاۃ کی اس عبارت سے بھی واضح ہے ''اور یہوداہ اپنے بھائی شمعون کے ساتھ گیا اور انہوں نے ان کنعانیوں کو جو صفت میں رہتے تھے، مارا اور شہر کو نیست و نابود کر دیا۔ سو اس شہر کا نام حُرمہ کہلایا''۔ (۱۰۴/ ج) اور اسی کتاب قضاۃ سے ثابت ہے کہ یہوداہ اور اس کے بھائی شمعون کی کنعانیوں کے خلاف فتوحات حضرت موسیٰؑ تو کیا ان کے خلیفہ حضرت یشوعؑ کی بھی موت کے بعد کے واقعات ہیں (۱۰۵/ الف)

۴۔ کتاب خروج میں ہے ''اور بنی اسرائیل جب تک آباد ملک میں نہ آئے، یعنی چالیس برس تک من کھاتے رہے۔ الغرض جب تک وہ ملک کنعان کی حدود تک نہ آئے من کھاتے رہے''۔ (۱۰۵/ ب) یہ بھی موسیٰؑ کا کلام نہیں ہوسکتا کیونکہ بنی اسرائیل سے من (ترنج کے پھل کی معجزانہ غذا) حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں بند نہیں کی گئی تھی اور ان کی زندگی میں بنی اسرائیل کنعان کے علاقے میں داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ سب کچھ حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ حضرت یشوعؑ کے زمانے میں ہوا (۱۰۵/ ج)

۵۔ فلسطین کی ایک بستی حبرون کا پرانا نام قریت اربع تھا۔ بنی اسرائیل نے حضرت یوشعؑ کے زمانے میں فلسطین کو فتح کرنے کے بعد اس کا نام حبرون رکھ دیا (۱۰۶/ الف) لیکن کتاب پیدائش میں متعدد مقامات پر حبرون کا ذکر کیا گیا ہے (۱۰۶/ ب) اس سے معلوم ہوا کہ کتاب پیدائش کے یہ مضامین ہرگز حضرت موسیٰؑ کا کلام نہیں ہوسکتے۔

۶۔ اسی طرح دان نام کے ایک شہر کا پرانا نام لیس تھا۔ اسے بنی اسرائیل نے حضرت یوشعؑ کی وفات کے بعد قاضیوں کے دور میں فتح کیا اور وہاں کے تمام باشندوں کو قتل کر کے شہر کو جلایا اور اس کی جگہ

نیا شہر آباد کیا اور اس کا نام دان رکھا۔ چنانچہ کتاب قضاۃ میں ہے ''اس شہر کا نام اپنے باپ دان کے نام پر جو اسرائیل کی اولاد تھا دان ہی رکھا لیکن پہلے اس شہر کا نام لیس تھا'' (۱۰۶/ ج) لیکن کتاب پیدائش میں اس شہر کا نام بھی مذکور ہے ''جب ابرام (حضرت ابراہیمؑ) نے سنا کہ اس کا بھائی گرفتار ہوا تو اس نے اپنے تین سو اٹھارہ مشاق خانہ زادوں کو لے کر دان تک ان کا تعاقب کیا'' (۱۰۷/ الف) مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ کتاب پیدائش کا یہ مضمون ہرگز حضرت موسیٰؑ کا کلام نہیں ہوسکتا۔

۷۔ کتابِ استثناء کے شروع کے پانچ فقرے ہرگز حضرت موسیٰؑ کا کلام نہیں ہو سکتے کیونکہ لکھنے والے نے حضرت موسیٰؑ کا ذکر غائب کے صیغے سے کیا ہے ''یہ وہی باتیں ہیں جو موسیٰؑ نے ...... سب اسرائیلیوں سے کہیں...... موسیٰؑ نے ان سب احکام کے مطابق ان سے یہ باتیں کہیں...... یردن کے پار مو آب کے میدان میں موسیٰؑ اس شریعت کو یوں بیان کرنے لگا'' (۱۰۷/ ب)

۸۔ کتابِ استثناء کے آخری باب میں حضرت موسیٰؑ کی وفات اور ان کی قبر کے محل وقوع کا ذکر ہے اور حضرت یوشعؑ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے جاں نشین ہوئے تھے اور اس باب کے آخر میں ہے ''اور اس وقت سے اب تک بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰؑ کے مانند جس سے خداوند نے روبرو باتیں کیں نہیں اٹھا اور اس کو خداوند نے ملک مصر میں فرعون اور اس کے سب خادموں اور اس کے سارے ملک کے سامنے سب نشانوں اور عجیب کاموں کے دکھانے کو بھیجا تھا یوں موسیٰ نے سب اسرائیلیوں کے سامنے زور آور ہاتھ اور بڑی ہیبت کے کام کر دکھائے'' (۱۰۷/ ج) کتابِ استثناء کے اس آخری باب کے متعلق صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ ہرگز حضرت موسیٰؑ کا اپنا کلام نہیں ہے۔ جب بائبل کی پہلی پانچ کتب (تورات) کا یہ حال ہے تو باقی کتب کو بھی اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ بائبل کی مذکورہ خرابیوں کے متعلق اہل کتاب دور از کار تاویلوں سے کام لیتے ہیں کہ اس طرح کے مضامین کا اضافہ حضرت عزراؑ نے یا کسی اور نے الہام سے کیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عزرا یا کسی اور کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ ان کتب میں اپنی طرف سے عبارتیں بڑھا کر اصل کلام میں زیادتی کے مرتکب ہوں؟ نیز جیسا کہ ہم اسی مضمون میں قبل ازیں اوپر بیان کر چکے ہیں کہ مثلاً بنیامین کی اولاد کے متعلق لاینحل اور ناقابل تطبیق اختلاف کے سلسلے میں بائبل کے شارحین نے یہ تاویل کی ہے کہ حضرت عزرا بیٹے کی جگہ پوتے اور پوتے کی جگہ بیٹے میں امتیاز نہ کر سکے کیونکہ عزرا نے ناقص اوراق سے ان کتب کو نقل کیا ہے۔ پس حضرت عزراؑ کی جمع کردہ کتب میں یقیناً تحریف ہوئی ہے لیکن اہل کتاب اپنی فطرت کے مطابق اس کا الزام حضرت عزرا پر لگا رہے ہیں یعنی بائبل کی یہ کتب بہرحال اور بہرصورت مُحرّف اور ناقابل اعتماد ہیں۔ ان حالات میں اہل کتاب کا یہ

دعویٰ ہرگز قبول نہیں کیا جاسکتا کہ بائبل کی کتب کی اصلاح بعد کے انبیاء کرتے چلے آئے ہیں جب کہ حضرت عزراؑ آدم کلارک جیسے مسیحی فضلا کے اعتراف کے مطابق (دو نبیوں حجیؑ اور زکریاؑ کی اعانت کے باوجود) بائبل کی کتب کو صحیح طور پر نقل کرنے سے قاصر رہے۔

بائبل کی اندرونی شہادتوں سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اس کی موجودہ کتب سے بہت سے مضامین ضائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ بائبل کے نئے عہد نامے میں یہوداہ کے خط میں ہے ''لیکن مقرب فرشتہ میکائیل نے موسیٰؑ کی لاش کی بابت ابلیس سے بحث وتکرار کرتے وقت لعن طعن کے ساتھ اس پر نالش کرنے کی جرأت نہ کی بلکہ یہ کہا کہ خداوند تجھے ملامت کرے'' (۱۰۸/ الف) یہاں میکائیل کے ساتھ شیطان کے جس جھگڑے کا ذکر ہے، عہد نامہ قدیم میں یہ مضمون کہیں نہیں ملتا۔

۲۔ نئے عہد نامے میں تیمتھیس کے نام پولس کا جو دوسرا خط ہے اس میں وہ لکھتا ہے کہ ''اور جس طرح کہ یننیس اور یمبریس نے موسیٰؑ کی مخالفت کی تھی، اسی طرح یہ لوگ بھی حق کی مخالفت کرتے ہیں.....'' (۱۰۸/ ب) یہ دونوں نام پرانے عہد نامے کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہیں۔

۳۔ نئے عہد نامے میں یہوداہ کا خط بھی شامل ہے اس میں اس نے حنوک کی ایک پیشین گوئی کا ذکر کیا ہے (۱۰۸/ ج) لیکن یہ مضمون بھی عہد نامہ قدیم کی کسی کتاب میں نہیں ہے۔

۴۔ یہوداہ کے اسی خط میں ہے ''اور جن فرشتوں نے اپنی حکومت کو قائم نہ رکھا بلکہ اپنے خاص مقام کو چھوڑ دیا ان کو اس نے دائمی قید میں تاریکی کے اندر روز عظیم کی عدالت تک رکھا ہے''۔ (۱۰۹/ الف) اور یہی مضمون پطرس کے دوسرے خط میں یوں دیا گیا ہے ''کیونکہ جب خدا نے گناہ کرنے والے فرشتوں کو نہ چھوڑا بلکہ جہنم میں بھیج کر تاریک غاروں میں ڈال دیا تا کہ عدالت کے دن تک حراست میں رہیں''۔ (۱۰۹/ ب) یہ مضمون عہد نامہ قدیم کی کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ قید میں ڈالے ہوئے ان فرشتوں سے مراد بہ ظاہر شیاطین ہیں۔ مگر شیاطین عدالت کے دن تک حراست میں ہیں تو بہ مطابق اناجیل شیطان حضرت یسوعؑ کو آزمانے کے لئے کہاں سے آ ٹپکا تھا؟ (۱۰۹/ ج)

۵۔ کرنتھیوں کے نام پولس کے خط میں ہے ''پھر پانچ سو سے زیادہ بھائیوں کو ایک ساتھ دکھائی دیا جن میں سے اکثر اب تک موجود ہیں اور بعض سو گئے''۔ (۱۱۰/ الف) مبینہ مصلوبیت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر حضرت یسوعؑ کا پانچ سو سے زائد آدمیوں کو دکھائی دینا نہ تو چاروں اناجیل میں مذکور ہے اور نہ ہی کتاب اعمال میں اس کا کوئی تذکرہ ہے۔ اگر مذکورہ مضامین عہد نامہ قدیم کی کتب اور اناجیل میں واقعی

موجود تھے اور بعد میں نکال لئے گئے تو ثابت ہوا کہ یہ کتب مکمل نہیں۔ اگر یہ مضامین ان کتب میں موجود ہی نہیں تھے تو عہد نامہ جدید کے ان مضامین کو لازماً جھوٹ قرار دینا ہوگا۔ دونوں صورتوں میں بائبل کا محرّف ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

بائبل کی کتب سے بعض مضامین کا غائب ہونا اور بعض مضامین کا اصل کتابوں میں زائد ہونا تو ایک طرف رہا، بائبل کی اندرونی شہادتوں سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ بائبل کے موجودہ مجموعے سے بہت سی کتب پوری کی پوری غائب ہیں۔ مثلاً

۱۔ کتاب گنتی میں ہے ''اسی سبب سے خداوند کے جنگ نامہ میں یوں لکھا ہے'' (۱۱۰/ ب) لیکن کتاب ''خدا کا جنگ نامہ'' دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں ہے۔

۲۔ کتاب یشوع میں ہے ''.....کیا یہ آشر کی کتاب میں نہیں لکھا ہے؟'' (۱۱۰/ ج) آشر کی جس کتاب کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے موجودہ بائبل میں شامل نہیں بلکہ مفقود ہے۔

۳۔ کتاب سموئیل اول میں ہے ''پھر سموئیل نے لوگوں کو حکومت کا طرز بتایا اور اسے کتاب میں لکھ کر خداوند کے حضور رکھ دیا'' (۱۱۱/ الف) سموئیل کی یہ کتاب دنیا میں ناپید ہے۔

۴۔ کتاب سلاطین اول میں ہے اور اس (سلیمان) نے تین ہزار مثلیں کہیں اور اس کے ایک ہزار پانچ گیت تھے۔ اور اس نے درختوں کا یعنی لبنان کے دیودار سے لے کر زوفا تک کا جو دیواروں پر اگتا ہے بیان کیا اور چوپایوں اور پرندوں اور رینگنے والے جانوروں اور مچھلیوں کا بھی بیان کیا'' (۱۱۱/ ب) حضرت سلیمانؑ کی یہ تینوں کتابیں مفقود ہیں البتہ حضرت سلیمانؑ کی کچھ کہاوتیں ہی باقی رہی ہیں۔

۵۔ اور اسی کتاب سلاطین اول میں ہے ''اور سلیمان کا باقی حال اور سب کچھ جو اس نے کیا اور اس کی حکمت، سو کیا وہ سلیمان کے احوال کی کتاب میں درج نہیں''۔ (۱۱۱/ ج) یہ کتاب بھی ناپید ہے۔

۶۔ کتاب تواریخ اول میں ہے ''اور داؤد بادشاہ کے کام شروع سے آخر تک سب کے سب سموئیل غیب بین کی تواریخ میں اور ناتن نبی کی تواریخ میں اور جاد غیب بین کی تواریخ میں یعنی اس کی ساری حکومت اور زور اور جو زمانے اس پر اور اسرائیل پر اور زمین کی سب مملکتوں پر گزرے سب اُن میں لکھے ہیں''۔ (۱۱۲/ الف) یہ تینوں کتابیں بھی مفقود ہیں۔

۷۔ کتاب تواریخ ثانی میں ہے ''اور رحُبعام کے کام اول سے آخر تک کیا وہ سمعیاہ نبی اور عیدو غیب بین کی تواریخ میں نسب ناموں کے مطابق قلم بند نہیں''؟ (۱۱۲/ ب) یہ دونوں کتابیں آج کہیں بھی موجود نہیں ہیں۔

۸۔اوراسی کتاب تواریخ دوم میں ہےاورسلیمان کے باقی کام شروع سے آخرتک کیاوہ ناتن نبی کی کتاب میں اورسیلانی اخیاہ کی پیشین گوئی میں اورعیدوغیب بین کی رؤیتوں کی کتاب میں جواس نے یربعام بن نباط کی بابت دیکھی تھیں مندرج نہیں ہیں؟ (۱۱۲/ ج) یہ تینوں کتابیں بھی گم شدہ ہیں۔

۹۔اوراسی کتاب تواریخ دوم میں ہے''اور یہوسفط کے باقی کام شروع سے آخرتک یاہو بن حنانی کی تاریخ میں درج ہیں جواسرائیل کے سلاطین کی کتاب میں شامل ہے'' (۱۱۳/ الف) اس سے معلوم ہورہاہے کہ کتاب سلاطین میں کتاب یاہو بھی شامل تھی جوآج مفقود ہے۔

۱۰۔اوراسی کتاب تواریخ دوم میں ہےاور''عزیاہ کے باقی کام شروع سے آخرتک آموس کے بیٹے یسعیاہ نے لکھے''۔ (۱۱۳/ ب) عزیاہ کے کاموں پر مشتمل یہ کتاب یسعیاہ موجودہ بائبل سے غائب ہے۔

۱۱۔اوراسی کتاب تواریخ دوم میں ہے''اورحزقیاہ کے باقی کام اوراس کے نیک اعمال آموس کے بیٹے یسعیاہ نبی کی رؤیا میں اور یہوداہ اوراسرائیل کے بادشاہوں کی کتاب میں قلم بند ہیں'' (۱۱۳/ ج) یہ دونوں کتابیں بھی مفقود ہیں۔

۱۲۔اوراسی کتاب تواریخ دوم میں ہے''اور یرمیاہ نے یوسیاہ پرنوحہ کیا.....اوردیکھووہ باتیں لوحوں میں لکھی ہیں''۔ (۱۱۴/ الف) یرمیاہ نبی کا یوسیاہ پر یہ مرثیہ آج موجودنہیں ہے۔

۱۳۔کتاب نحمیاہ میں ہے''بنی لاوی کے آبائی خاندانوں کے سردار یوحنان بن الیاسب کے دنوں تک تواریخ کی کتاب میں لکھے جاتے تھے'' (۱۱۴/ ب) تواریخ کی یہ کتاب بھی مفقود ہے۔ بائبل کی جو کتابیں موجود ہیں ان میں سے متعدد کتب کے مستند ہونے میں عیسائیوں کا شروع سے اختلاف چلا آرہاہے کبھی وہ انہیں غیر معتبر اور کبھی معتبر قرار دیتے چلے آئے ہیں۔آج رومن کیتھولک چرچ کی بائبل میں متعدد کتب ایسی ہیں جنہیں پروٹسٹنٹ چرچ اپوکریفا یعنی جعلی قرار دیتا ہے۔ہم نے اس سلسلۂ مضامین میں پروٹسٹنٹ چرچ کی بائبل کولیا ہے کیونکہ اس میں موجود کتب پر سب عیسائیوں کا اتفاق ہے۔عیسائی حضرات کا قرآن کریم پرایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس کے بعض مضامین مثلاً سورہ کہف میں مذکور حضرت موسیٰ اور حضرت خضرؑ کا واقعہ اور مثلاً سورۂ آل عمران میں مذکور حضرت عیسیٰؑ کا گہوارے میں لوگوں سے باتیں کرنے کا معجزہ وغیرہ بائبل میں چونکہ مذکورنہیں،لہٰذا یہ قول ان کے قابل قبول نہیں۔اوپرہم دیکھ چکے ہیں کہ بائبل کی اندرونی شہادتوں کی بناء پراس سے نہ صرف بعض مضامین ہی بلکہ بعض پوری کی پوری کتب غائب ہیں۔اس صورت حال میں اہل کتاب کا قرآن کریم پر مذکورہ اعتراض لغوہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔نیز عقل سلیم کا فیصلہ یہی ہے کہ قرآن کریم کے مضامین کو پرکھنے کے لئے محرف بائبل کو ہرگز معیارنہیں

ٹھہرایا جاسکتا بلکہ بائبل کے مضامین کے صحیح اور غلط ہونے کا قرآن کریم کی مدد سے فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت یسوع (عیسیٰ) نے اپنے زمانے میں تورات اور ملحقہ کتب کے صحیح ہونے کی تصدیق فرمادی تھی تو یہ قول اس لئے قابل قبول نہیں ہوسکتا کہ نئے عہدنامے کی اناجیل اربعہ کے (جھوٹے) مضامین سے حضرت یسوعؑ تو سچے مسیح ہی ثابت نہیں ہوتے۔ ان (محرف) اناجیل کی رو سے حضرت یسوعؑ نے بہت سی ایسی پیشین گوئیاں فرمائیں جو قطعاً غلط ثابت ہوئیں جیسا کہ ہم اس سلسلۂ مضامین میں متعلقہ عنوانات کے تحت بخوبی واضح کرچکے ہیں (۱۱۴/ ج) حضرت یسوعؑ پر نازل ہونے والی اصل انجیل تو ناپید ہے موجودہ اناجیل میں حضرت یسوعؑ کی مبینہ مصلوبیت اور تدفین وغیرہ کے حالات مذکور ہیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ ایسے مضامین ہرگز حضرت یسوعؑ کا کلام نہیں ہوسکتے بلکہ یہ بعد کے لوگوں کی تالیفات ہیں۔ جب بائبل کے (محرّف اور جھوٹے) مضامین کی رو سے اسرائیلی انبیاء علیہم السلام تک ناقابل اعتماد ٹھہرتے ہیں تو بائبل کی کتب کے وہ مؤلفین جو نبی نہیں تھے، ان کا بھی قطعاً اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ الغرض بائبل کے مضامین کی اندرونی شہادتیں اس میں بڑے وسیع پیمانے پر تحریف کا ناقابل تردید ثبوت مہیا کررہی ہیں۔ مطبع (پریس) کی ایجاد اور علوم وفنون کی عام نشر واشاعت کے بعد عین ممکن ہے کہ بائبل میں تحریف کا سلسلہ بڑی حد تک کم ہوگیا ہو لیکن بالکل ختم بھی نہیں ہوا جیسا کہ ہم زیر عنوان ''تحریف بائبل میں تسلسل'' واضح کرچکے ہیں۔ (۱۱۵/ الف) اور ''معجزات'' کے عنوان کے تحت بھی اس تحریف کی ہم مثالیں پیش کرچکے ہیں۔ بائبل میں تحریف کے سلسلے میں اگر غیر متعصب اہل کتاب محققین اور خود بائبل کے شارحین اور مفسرین کے اپنے اعترافی اقوال کو یک جا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ علوم ومعارف پر حوالے کی مشہور کتب مثلاً انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بائبل اور اناجیل (Gospels) کے عنوانات کا مطالعہ بھی بڑی حد تک چشم کشا ہوسکتا ہے۔ ان کتب کے اصل مؤلفین کی شناخت کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا انتہائی مشکل ہے۔

اہل کتاب جب اس محرّف بائبل سے اپنا سچا مومن ہونا ہی ثابت نہیں کرسکتے اور حضرت یسوعؑ کو سچا مسیح ہی نہیں قرار دے سکتے۔ اپنے لئے جنت کا استحقاق تو ثابت کرنا درکنار بلکہ مثلاً کتاب یرمیاہ اور کتاب احبار کے مضامین کی رو سے سب ہی اہل کتاب سنگ سار کئے جانے کے لائق ٹھہرتے ہیں جیسا کہ ہم قبل ازیں اسی مضمون میں اوپر واضح کرچکے ہیں، تو انہیں قرآن کریم سے ہی بھرپور رہنمائی اور مدد حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اس بہت بڑی نعمت کو ٹھکرا کر سخت ناشکری کررہے ہیں سورۂ یونس میں ہے کہ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں

جو روگ ہیں ان کے لئے شفا ہے، اور ایمان والوں کے لئے رحمت ہے (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ لوگوں کو تو (اللہ کے اس انعام اور رحمت پر) خوش ہو جانا چاہئے کہ (یہ قرآن انہیں) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ملا ہے (اور قرآن کی) یہ نعمت ان تمام چیزوں سے بدرجہا بہتر ہے جنہیں وہ جمع کر رہے ہیں۔ (۱۱۵/ب)

(ب) جمع وتدوین قرآن:

قرآن کریم کوئی ۲۳ سال تک بہ تدریج نازل ہوتا رہا۔ اس کی مختلف آیات کا نزول خاص حالات اور ضرورتوں کے مطابق ہوا۔ نزول وحی کے ابتدائی زمانے میں جب قرآنی آیات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتیں تو آپ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں اور اس مقصد کے لئے آپ وحی کے کلمات کو جلدی جلدی دہرانے لگتے تھے۔ اس پر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا (۱۱۵/ج) ''اور (اے پیغمبر!) تو قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کر اس سے پہلے کہ تیری طرف اس (قرآن) کی جو وحی کی جاتی ہے وہ پوری کی جائے، اور (بطور دعا) کہہ کہ اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما''۔ اور سورۂ قیامت میں ہے لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (۱۱۶/الف) ''(اے پیغمبر!) تو اس (قرآن) کو جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کر۔ اس کا جمع کرنا اور اسے (تیری زبان سے) پڑھوانا تو ہمارے ذمے ہے۔ پھر جب ہم اسے پڑھ لیں پھر تو اس کے پڑھنے کی پیروی کر''۔ اس حکم کے بعد آپ نزولِ وحی کے وقت قرآنی آیات کو خاموشی سے سنا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حسب وعدہ وبشارت آپ کے قلب مبارک کو قرآن کریم کا محفوظ ترین خزینہ بنا دیا تھا جہاں معمولی سے معمولی غلطی یا تغیر وتبدل کا قطعاً کوئی امکان نہ تھا۔ آپ ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبرائیلؑ کو قرآن سنایا کرتے تھے اور اپنی دنیوی حیات طیبہ کے آخری رمضان میں آپ نے حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ قرآن کریم کا دو مرتبہ دور کیا۔ (۱۱۶/ب)

دورِ نبوی میں آپ کے اصحابؓ کے لئے بھی قرآن کریم کی حفاظت کی اولیں صورت یہ تھی کہ وہ اپنی حیرت انگیز قوت حافظہ اور قرآن کریم سے بے حد رغبت ومحبت کی بنا پر نہایت ہی ذوق وشوق سے اسے زبانی یاد کرتے اور نمازوں ودیگر مواقع پر اس کی بہ کثرت تلاوت کو اپنی زندگی کا نہایت ہی قیمتی سرمایہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ایک قلیل مدت میں ہی صحابہ کرامؓ کی ایک بہت بڑی تعداد نے قرآن کریم کو از بر یاد کر لیا۔ قرآن کریم کی سورہ عنکبوت میں ہے کہ یہ قرآن تو روشن آیتیں ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ

ہیں اور ہماری آیتوں کا انکار صرف ظالم لوگ ہی کرتے ہیں۔ (۱۱۶/ ج) قرآن کریم کے ان حفاظ میں ان حضرات کے نام مشہور ومعروف ہیں: ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود، حذیفہ بن یمان، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، ابوہریرہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عمرو بن العاص، معاویہ بن ابی سفیان، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن سائب، مجمع بن جاریہ، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، انس بن مالک، ام المومنین عائشہ، ام المومنین حفصۃ ام المومنین ام سلمہ، رضی اللہ عنہم اجمعین حفاظِ قرآن کی کثرت کا یہ حال تھا کہ مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف سریہ بئر معونہ میں ہی چوٹی کے ستر قاری صحابۂ کرامؓ کو تعلیم قرآن کے لئے بھیجا تھا جنہیں دھوکہ دے کر شہید کیا گیا۔ (۱۱۷/ ب) ان صحابہ کرامؓ کے علاوہ جنہیں پورا قرآن یاد تھا، ایسے لاتعداد اصحاب رسول ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے متفرق حصے یاد کر رکھے تھے (۱۱۷/ ج) قرآن کریم کو زبانی یاد کرنے کے شوق اور اس سے گہری قلبی محبت کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کا گھر ایک چشمے کے کنارے پر واقع تھا۔ حضرت عمروؓ سات سال کے تھے اور ان کا پورا گھرانا ابھی حالتِ کفر میں ہی تھا لیکن اس راستے سے آنے جانے والے مسافر صحابہ کرامؓ سے وہ قرآن کریم کی آیات سنتے اور یاد کرتے رہتے تھے۔ بعد میں وہ اپنے قبیلے کے دیگر افراد کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے تو انہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ازبر یاد تھا اسی لئے انہیں اپنے قبیلے کے ان مسلم افراد کے لئے نماز میں امام مقرر کیا گیا تھا۔ (۱۱۷)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر غارِ حرا میں سب سے پہلی وحی میں سورہ اقراء کی ابتدائی آیات نازل ہوئی تھیں۔ (۱۱۸/ الف) اس کے بعد کوئی دو سال تک وحی کا نزول نہ ہوا۔ اسے دورِ فترتِ وحی کہا جاتا ہے۔ دورِ فترت کے بعد پہلی وحی میں سورہ مدثر کی ابتدائی آیات کا نزول ہوا۔ (۱۱۸/ ب) قرآن کریم جس ترتیب سے نازل ہوا اسے ترتیبِ نزولی کہا جاتا ہے لیکن جس ترتیب سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جمع کرایا اسے ترتیب توقیفی کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ ترتیب بھی صحابہ کرامؓ کے اپنے اندازے اور قیاس سے نہیں بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے۔ زرکشی صاحب البرہان فی علوم القرآن اور ابوجعفر جیسے بہت سے اہل علم نے اس پر اجماع امت کا دعویٰ کیا ہے اور اس سلسلے میں روایات بہ کثرت ہیں (۱۱۸/ ج) اس کا نمایاں ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم کی نمازوں میں خصوصاً اور اس کے علاوہ بھی عموماً تلاوت نہایت کثرت سے کی جاتی تھی۔ سورۂ مزمل میں ہے کہ (اے پیغمبر!) بے شک تیرا رب بہ خوبی جانتا ہے کہ تو اور تیرے ساتھ لوگوں کی ایک جماعت (کبھی) دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات (نماز میں) قیام کیا کرتی ہے (۱۱۹/ الف) ظاہر ہے کہ اس طویل قیام میں قرآن

کریم کی تلاوت ایک خاص ترتیب کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ اور مثلاً مکی دور میں جب کچھ مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی حبشہ کے لئے عازم سفر ہوئے لیکن راستے میں ابن الدغنہ سے ملاقات اور اس کے اصرار پر واپس مکہ تشریف لے آئے۔ ابن الدغنہ نے قریش مکہ سے آپ کے لئے اس شرط پر امان حاصل کرلی کہ آپ رات کو نماز میں قرآن کریم کی تلاوت بلند آواز سے نہ کریں کیونکہ اس سے قریش کی عورتیں اور بچے قرآن کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ لیکن بعد میں حضرت ابوبکرؓ اس شرط پر قائم نہ رہ سکے اور نماز میں قرآن کریم کی بلند آواز سے تلاوت کا معمول ترک نہ کیا اور ابن الدغنہ کی امان واپس کردی (۱۱۹/ ب) ظاہر ہے کہ اگر مکی دور میں نازل ہونے والی قرآنی آیات کی کوئی ترتیب ہی نہیں تھی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ قرآن کریم کی تلاوت کیسے کرسکتے تھے؟ قرآن کریم لاتعداد اصحاب رسول کے سینوں میں محفوظ تھا اس لئے آیات کی ترتیب میں کسی خلل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض مستشرقین کا یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں جب قرآن کریم کی جمع وتدوین حضرت زیدؓ بن ثابت کے ذریعے ہوئی تو حضرت زیدؓ کو جس ترتیب سے یہ آیات ملتی گئیں، اسی کے مطابق وہ لکھتے چلے گئے۔ قرآن کریم اگرچہ اصحاب رسول کے دلوں میں خوب محفوظ تھا اور حفظ قرآن کا یہ سلسلہ امت مسلمہ میں تواتر سے اب تک چلا آرہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی کتابت کا بھی خاص اہتمام فرمایا۔ اس مقصد کے لئے کاتبین کی ایک جماعت موجود تھی تاکہ بہ وقت ضرورت جو بھی موجود ہو وہ قرآنی وحی اور مکاتیب نبوی وغیرہ کی کتابت کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ مشہور کاتبین کے اسماء گرامی یہ ہیں: خلفائے راشدین ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم کے علاوہ ابان بن سعید بن العاص، ابی بن کعب، ارقم بن ابی الارقم، ثابت بن قیس بن شماس، حنظلہ بن ربیع، خالد بن سعید بن العاص، خالد بن ولید، زبیر بن العوام، زید بن ثابت، عامر بن فہیرہ، عبداللہ بن ارقم بن ابی الارقم، عبداللہ بن زید بن عبدربہ، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، علاء بن حضرمی، شریح بن حضرمی، علاء بن عقبہ، محمد بن مسلمہ، معاویہ بن ابی سفیان، مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم اجمعین (۱۱۹/ ج)۔

قرآن کریم کی یہ کتابت مکی دور سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں عرب میں کاغذ اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور تھا۔ اس لئے قرآنی آیات اکثر وبیشتر چمڑے کے ٹکڑوں، پتھر کی سلوں، کھجور کی شاخوں، درختوں کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں وغیرہ پر لکھی جاتی تھیں۔ بعد میں جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں کاغذ پر قرآن کریم کی جمع وتدوین ہوئی تو حفاظ قرآن کے سینوں کے علاوہ

مذکورہ اشیا پر لکھی ہوئی قرآنی آیات سے بھی بھرپور مدد لی گئی۔ الغرض دورِ نبوی میں قرآن کریم تحریری صورت میں بھی محفوظ کر دیا گیا تھا لیکن یہ کتابی شکل میں ہونے کی بہ جائے متفرق پارچوں کی صورت میں تھا۔ صحابہ کرامؓ اپنے طور پر بھی اپنی یادداشت اور تعلیم وتعلم کے لئے قرآنی آیات کو لکھ لیتے تھے اور یہ سلسلہ شروع ہی سے جاری تھا۔ مثلاً مکی دور میں حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے کے واقعے میں یہ بات ملتی ہے کہ ان کی بہن فاطمہؓ بنت خطاب اور بہنوئی حضرت سعیدؓ بن زید پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے اور جب حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ غصے کی حالت میں اپنے بہنوئی کے گھر میں داخل ہوئے وہاں ایک صحیفہ رکھا تھا جس میں سورۂ طٰہٰ کی آیات تھیں اور حضرت خبابؓ بن ارت پڑھا رہے تھے۔ (۱۲۰/ الف)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کے علاقے میں قرآن کریم ساتھ لے کر سفر کرنے سے منع فرمایا (تاکہ قرآن کریم دشمنوں کے ہاتھ نہ لگے اور بے حرمتی سے محفوظ رہے) (۱۲۰/ ب) اس سے معلوم ہوا کہ جو اصحاب لکھنا پڑھنا جانتے تھے، انہوں نے اپنے طور پر قرآن کریم کی سورتوں اور آیات کو اپنی یادداشت اور ناظرہ تلاوت کے لئے لکھ رکھا تھا۔ طبرانیؒ کی معجم کبیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص قرآن کریم کے نسخے میں دیکھے بغیر (زبانی) تلاوت کرے تو اس کا ثواب ہزار درجے ہے اور اگر قرآن کے نسخے میں دیکھ کر تلاوت کرے تو اس کا ثواب دو ہزار درجے ہے۔ (۱۲۰/ ج)

قرآن کریم کی تلاوت ہی نہیں بلکہ اس کی کتابت بھی ترتیب توقیفی کے مطابق ہوئی۔ حضرت عثمانؓ بن العاص فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ کاتبین وحی کو یہ بھی بتاتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھی جائے۔ (۱۲۱/ الف) اسی طرح ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کی حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو آپ کسی کاتب کو بلا کر فرماتے کہ ان آیات کو اس سورت میں جس میں فلاں مضمون ہے، شامل کر دو (۱۲۱/ ب) چونکہ ترتیب نزولی بذات خود مقصود ہی نہیں تھی لہٰذا صحابہ کرامؓ نے اسے نظر انداز فرمایا ورنہ اس ترتیب کے تحت قرآن کریم کی کتابت کے وہ دوسروں سے کہیں زیادہ اہل تھے کہ انہی کی آنکھوں کے سامنے قرآن نازل ہوتا رہا تھا۔ مستشرقین وغیرہ کی اس طرح کی مساعی اول تو محض ظنی اور قیاسی ہیں، قطعی یقین اور وثوق سے پوری ترتیب نزولی کو معلوم کرپانا ناممکن ہے۔ دوسرے اس کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں۔ ان کی اس طرح کی مساعی اس فاسد خیال کے تحت ہیں کہ قرآن کریم (معاذ اللہ) صحیح طور پر مرتب نہیں ہوا ہے۔ الغرض قرآن کریم کی کتابت کا پہلا مرحلہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی

حیات طیبہ میں پورا ہوا۔ امام حاکمؒ نے حضرت زیدؓ بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآن کو پارچوں پر مرتب کیا کرتے تھے۔ امام حاکمؒ نے اس روایت کو شرط شیخین پر صحیح قرار دیا ہے یعنی روایات واحادیث کی صحت کا جو معیار امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے قائم کیا ہے، یہ روایت اس پر پوری اترتی ہے۔ علامہ سیوطیؒ اتقان میں لکھتے ہیں کہ قرآن کی آیات کی ترتیب کے توقیفی ہونے میں قطعاً کوئی شبہہ نہیں بلکہ بہت سے اہل علم مثلاً زرکشی نے اپنی کتاب برہان میں اور ابوجعفر بن زبیر نے مناسبات میں اس پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔ (۱۲۱/ ج)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں جنگ یمامہ میں پانچ یا چھ سو کے قریب صحابہ کرامؓ نے جام شہادت نوش کیا۔ (۱۲۲/ الف) جن میں قرآن کریم کے حافظوں اور قاریوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ اس جنگ میں مہاجرین وانصار بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ مہاجرین کا جھنڈا حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ اور انصار کا جھنڈا حضرت ثابتؓ بن قیس بن شماس کے پاس تھا۔ یہ دونوں جلیل القدر اصحاب اس جنگ کے شہداء میں شامل ہیں۔ علامہ ابن کثیرؒ نے تقریباً ۲۷ مہاجرین اور ۳۸ انصار صحابہؓ کے اسما گرامی لکھے ہیں جو اس جنگ میں شہید ہوئے۔ ان کی اکثریت قدیم الاسلام ہے اور ان میں کوئی سترہ بدری صحابی ہیں۔ ان شہدا میں ثابت بن قیس، حزن بن ابی وھب، زید بن خطاب، سالم بن عبید مولیٰ ابی حذیفہ، ابودجانہ سماک بن طرشہ، شجاع بن وھب، عبداللہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول، عباد بن بشر، سائب بن عثمان بن مظعون، سائب بن عوام، عبداللہ بن سہیل بن عمرو، معن بن عدی، ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہؓ جیسے عظیم المرتبت اصحاب رسول شامل ہیں۔ کل شہدا کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے۔ (۱۲۲/ ب) اس سے واضح ہوا کہ بعض مستشرقین کا محض تعصب اور سینہ زوری پر مبنی یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے کہ جنگ یمامہ میں حفاظ بڑی تعداد میں شریک اور شہید نہیں ہوئے تھے اور یہ کہ مسیلمہ کذاب کے خلاف اس جنگ میں نومسلم حضرات نے ہی حصہ لیا تھا۔ اس طرح کے (جھوٹے) مفروضات سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں قرآن کریم کی جمع وتدوین کا کام بہ قول ان کے نہیں ہوا تھا۔

جنگ یمامہ میں حفاظ اور قرّاء صحابہ کی ایک بڑی تعداد کی شہادت کے بعد حضرت عمرؓ کو بہ جا طور پر اندیشہ لاحق ہوا کہ غیر مسلموں کے خلاف جنگوں کا جو طویل سلسلہ چل پڑا ہے، ان میں قرآن کریم کے حفاظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو قرآن کریم کا بڑا حصہ کہیں ناپید نہ ہو جائے۔ انہوں نے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا اور قرآن کریم کو کتابی صورت میں جمع کر کے یک جا کرنے کا مشورہ دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ابتدا میں تامل ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ پورا قرآن

مختلف پارچوں وغیرہ پر لکھوایا تھا لیکن آپ نے اسے کتابی شکل میں یک جا نہیں فرمایا تھا تو ہم اسے کیسے کریں۔ لیکن بحث وتمحیص کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس پر شرح صدر ہوگیا تو انہوں نے دورِ نبوی کے مشہور کاتب وحی حضرت زیدؓ بن ثابت سے فرمایا کہ تم نوجوان اور عقل مند ہو اور ہمیں تمہارے متعلق کوئی بدگمانی نہیں (یعنی تم پر مکمل اعتماد ہے) اور تم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآنی وحی لکھتے رہے ہو اس لئے قرآن کریم کی آیات کو تلاش کر کے انہیں جمع کرو۔ حضرت زیدؓ بن ثابت فرماتے ہیں کہ اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو اس کا مجھ پر اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا قرآن کریم کو جمع کرنے کے کام کا بوجھ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کے بار بار اصرار پر اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے میرا سینہ کھول دیا اور میں قرآنی آیات کی تلاش میں لگ گیا۔ اس طرح میں نے کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کو جمع کیا (۱۲۲/ ج) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم میں معلّم کتاب وحکمت قرار دیا گیا ہے (۱۲۳/ الف) اس لئے اصحاب کرامؓ صاحب حکمت تھے۔ وہ قرآن کریم کی جمع وتدوین اس طرح کرنا چاہتے تھے کہ آئندہ نسلوں تک اس کا طبقاتی تواتر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے پوری طرح برقرار رہے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت قرآن کریم کے خود حافظ تھے۔ وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے۔ وہ یہ بھی کر سکتے تھے کہ صحابہ کرامؓ میں سے قرآن کریم کے حفاظ کی ایک جماعت کی مدد سے ایک نسخہ مرتب کر ڈالتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتبین وحی سے متفرق پارچوں وغیرہ پر جو مکمل قرآن لکھا رکھا تھا، حضرت زیدؓ نئے نسخے کی تیاری میں صرف اسی سے استفادہ کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں جمع نہیں کی جب تک کہ اس کے متواتر ہونے کی زبانی اور تحریری شہادتیں نہایت محنت اور جانفشانی سے حاصل نہ کرلیں۔ قرآن کریم کی جو آیات خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتبین وحی کو لکھوائی تھیں نہ صرف حضرت زیدؓ نے انہیں اکٹھا کرایا۔ بلکہ یہ عام اعلان بھی کر دیا کہ جس نے بھی اپنے طور پر قرآن کریم کا جو بھی حصہ لکھ رکھا ہے وہ اسے حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے۔ کاتبین وحی کی لکھی ہوئی کوئی آیت تب ہی قبول کی جاتی تھی جب کہ دو معتبر گواہ اس امر کی شہادت دیں کہ یہ آیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے لکھوائی تھی، یا آپ نے خود اس کی تلاوت فرمائی یا آپ کے سامنے اس کی تلاوت کی گئی تھی۔ ابن ابی داؤد نے عروہ سے روایت بیان کی ہے کہ اگرچہ حضرت زیدؓ بن ثابت خود حافظ قرآن تھے لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت زیدؓ دونوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ تم مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ۔ جو کوئی تمہارے پاس کتاب اللہ کی آیات لے کر آئے اور ان پر دو گواہ بھی پیش

کرے تو ان آیات کو لکھتے جاؤ۔ جو آیات بہت سے اصحاب نے اپنے طور پر لکھ رکھی تھیں ان کے ساتھ ان کا تقابل کیا جاتا تھا اور اس امر کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا کہ یہ لکھی ہوئی آیات کثیر التعداد صحابہ کرامؓ کے سینوں میں بھی محفوظ ہوں۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کے اس کام میں حضرت عمر فاروقؓ بھی ان کی بھرپور مدد کرتے تھے۔ (۱۲۳/ ب) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی جو کتابت لکڑی، پتھر وغیرہ کی تختیوں، کھجور کے پتوں اور دیگر قسم کے متعدد پارچوں پر کرائی تھی اس سے مقصود قرآن کریم کی تحریری حفاظت تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن کریم کی جو کتابت کرائی اس سے مقصود اسے کاغذوں پر جمع کرنا اور یک جا کرنا تھا۔ موطا امام مالکؒ میں حضرت سالم بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ابوبکرؓ نے قرآن کو کاغذوں میں (لکھوا کر) جمع کرایا (۱۲۳/ ج) اور مغازی موسیٰ بن عقبہ میں ہے کہ ابوبکرؓ کے زمانے میں قرآن کاغذ پر لکھ کر جمع کیا گیا (۱۲۴/ الف) بعض شرق شناسوں کا یہ دعویٰ قطعاً بے بنیاد ہے کہ جنگ یمامہ میں قرا اور حفاظ صحابہ کی شہادت سے قرآن کریم ضائع ہونے کی فکر حضرت عمرؓ کو اس لئے لاحق ہوئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پورا قرآن نہیں بلکہ صرف اس کے کچھ حصے اکٹھے کئے گئے تھے۔ یہاں اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں جمع قرآن میں صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا تھا کہ ان آیات کو جمع کیا جائے جو دور نبوی میں کسی چیز مثلاً سفید پتھر کی تراشی ہوئی تختیوں، سفید چمڑوں، لکڑی کی ہم وار تختیوں اور کھجور کے پتوں وغیرہ پر لکھی ہوئی تھیں یا صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا تھا کہ وہی آیات لکھی جائیں جو کسی کو زبانی یاد ہوں یا صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ وہی آیات یک جا کی جائیں جو کسی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوں بلکہ حفاظ کے سینوں سمیت ان تمام مصادر و ذرائع کو بیک وقت ملحوظ رکھا گیا اسی لئے حفاظ و قرا صحابہ کرامؓ کی بڑی تعداد میں شہادت تشویش کا سبب بنی تھی، جمع قرآن کے سلسلے میں مذکورہ تمام ذرائع کے استعمال اور مکتوبی آیات پر شہادتیں حاصل کرنے کا اہتمام اس لئے کیا گیا کہ کسی بھی طرح کے خطا اور سہو و نسیان کا احتمال تک باقی نہ رہے۔ یہاں دل چسپ امر یہ ہے کہ یہ شرق شناس کبھی تو یہ مفروضہ قائم کرتے ہیں کہ جنگ یمامہ میں حفاظ کی بڑی تعداد شہید ہی نہیں ہوئی تھی اور کبھی یہ مفروضہ تراشتے ہیں کہ اس جنگ میں حفاظ کی بڑی تعداد کی شہادت پر تشویش کی وجہ یہ تھی کہ دور نبوی میں پورا قرآن نہیں لکھا گیا تھا۔ اس طرح کے متضاد مفروضات سے من پسند لیکن سراسر بے بنیاد نتائج اخذ کرنے کو وہ بہ قول خود علمی تحقیق کا نام دیتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور کا یہ نسخہ ان کے بعد خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کی تحویل میں رہا۔ چونکہ ان کی شہادت کے بعد نئے خلیفہ کا تقرر فوری طور پر نہیں ہوا تھا اس لئے حضرت عمرؓ کے دیگر سامان کے

ساتھ یہ نسخہ ان کی صاحب زادی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس رہا۔ حضرت حفصہ معمولی خاتون نہیں ہیں بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ اور ام المومنین ہیں۔ اس لئے ان کی تحویل میں اس نسخے کے ہونے پر قطعاً کسی کو کوئی بدگمانی یا شکایت نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ وہ معتبر اور معیاری نسخہ تھا جسے پوری امت کی اجماعی تصدیق حاصل تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیدنا حضرت علیؓ اور دیگر متعدد اصحاب نے انفرادی حیثیت سے قرآنی مجموعے تیار نہیں کئے ہوں گے لیکن ایسا معیاری نسخہ جسے پوری امت کی تصدیق وتائید حاصل ہو اور جو سب ہی کے لئے حجت (معتبر ومستند) ہو وہ سب سے پہلے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مرتب کروایا۔ اس نسخہ کو ''اُمّ'' کہا جاتا ہے۔ اس میں قرآنی آیات تو رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب کے عین مطابق تھیں لیکن سورتوں کو ترتیب نہیں دی گئی تھی بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی (۱۲۴/ب) یہ نسخہ خط حیری میں لکھا گیا تھا (۱۲۴/ج)

قرآن کریم کی تیسری مرتبہ کتابت حضرت عثمان کے دور میں ہوئی جس سبب قرأتوں کے اختلاف کو دور کرنا تھا۔ ابتدا میں تو لوگوں کی سہولت کے لئے قرأتوں کا یہ اختلاف دور نبوی سے ہی چل رہا تھا۔ امام ترمذیؒ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابی بن کعب کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مروہ کے پتھروں کے قریب حضرت جبرئیل سے ہوئی۔ آپ نے حضرت جبرئیل سے فرمایا کہ میں ایک ناخواندہ امت کی طرف بھیجا گیا ہوں جس میں بہت بوڑھے لوگ بھی شامل ہیں اور جس میں بوڑھی عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ حضرت جبرئیل نے کہا کہ انہیں حکم دیجئے کہ وہ قرآن کو سات حروف پر پڑھیں (۱۲۵/الف) اس سہولت کے تحت جس نے جس قرأت سے قرآن کریم رسول اللہ ﷺ سے سیکھا اسی کو وہ دوسروں تک منتقل کرتا رہا۔ اس سلسلے میں ابتدا میں جو تنازعہ بعض صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت عمرؓ کا حضرت ہشامؓ بن حکیم کے ساتھ اور حضرت ابی بن کعب کا ایک اور شخص کے ساتھ پیدا ہوا تو اسے رسول اکرم ﷺ نے یہ کہہ کر رفع فرمادیا کہ سب کی قرأت صحیح ہے کیونکہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے (۱۲۵/ب) حضرت ابی بن کعب کی سات حروف پر نزول قرآن کی اور روایات بھی صحاح ستہ میں موجود ہیں۔ بلکہ سات حرفوں پر نزول قرآن کی روایت اکیس صحابہ کرامؓ سے مروی ہے اور ابوعبید نے اسے حدیث متواتر قرار دیا ہے (۱۲۵/ج) یوں صحابہ کرام کی حد تک تو قرأتوں کے اختلاف سے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا لیکن جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ماخوذ اپنی اپنی قرأت پر لوگوں کو قرآن کریم کی تعلیم دی تو تمام لوگوں میں عموماً اور عجمیوں میں خصوصاً باہم اختلافات پیدا ہونے لگے جو بہ تدریج مناقشات (جھگڑوں) کی صورت اختیار کرنے لگے۔ قرأتوں کا یہ اختلاف سات طرح کا تھا جس میں مثلاً کسی لفظ کو

مفرد یا جمع، مذکر یا مؤنث پڑھنے کا، بعض الفاظ میں وجوہ اعراب (زبر، زیر، پیش) کا، بعض میں کسی لفظ کے مقدم ومؤخر ہونے کا یا ایک لفظ کے حروف میں یا عبارت کے الفاظ میں کمی بیشی کا، کسی لفظ میں افعال کے صیغوں کا، کسی لفظ کے لہجوں یعنی اظہار وادغام، امالہ وقصر، تفخیم وترقیق وغیرہ کا، اور بدلیت یعنی ایک لفظ کی بہ جائے دوسرے ہم معنی لفظ کے استعمال کا اختلاف شامل تھا۔ دور نبوی کے اختلاف قرأت کی یہی صحیح ترین تعبیر ہے (۱۲۶/ الف) حضرت عثمانؓ کے دور خلافت تک روم وایران کی فتوحات کے بعد عجمیوں کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ حضرت حذیفہؓ بن الیمان آرمینیا اور آذربائیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے۔ انہوں نے وہاں لوگوں کو قرآن کریم کی قرأت کے بارے میں باہم اختلاف کرتے اور جھگڑتے دیکھا۔ اس جھگڑے کا بڑا نقصان یہ نظر آرہا تھا کہ چونکہ یہ لوگ سات حرفوں یعنی قرأت کے سات طرح کے اختلاف سے بے خبر ہیں اس لئے آپس کے جھگڑوں میں وہ کہیں متواتر قرأتوں کا انکار نہ کرنے لگ جائیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں جو قرآنی نسخہ مرتب کیا گیا تھا اس میں تو ان ساتوں حروف کو جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن انفرادی طور پر دوسرے حضرات نے جو قرآنی نسخے اپنے پاس لکھ رکھے تھے ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ نیز ان کا رسم الخط بھی یک ساں نہ تھا۔ لہٰذا اس کی شدید ضرورت تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں، جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور جن کے صحیح ہونے پر سب کا اتفاق ہو۔ سب سے پہلے حضرت حذیفہؓ بن الیمان نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے حضرت عثمان کو مشورہ دیا کہ اس صورت حال کی اصلاح جلد از جلد ہونی چاہئے۔ اس سے پہلے کہ یہ امت کتاب اللہ کے متعلق یہود ونصاریٰ کی طرح اختلافات کا شکار ہو۔ حضرت حذیفہؓ نے وضاحت فرمائی کہ میں نے آرمینیا کے محاذ پر دیکھا ہے کہ شام کے لوگ حضرت ابیؓ بن کعب کی قرأت پر قرآن پڑھتے ہیں اور عراق کے لوگ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی قرأت پر قرآن پڑھتے ہیں جسے شام کے لوگوں نے نہیں سنا ہوتا، اور عراق کے لوگ حضرت ابیؓ بن کعب کی قرأت سے بے خبر ہیں۔ اس اختلاف کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔ خود مدینہ منورہ میں بھی حضرت عثمانؓ کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ ایک مُعلّم نے اپنے شاگردوں کو ایک قرأت کے مطابق اور دوسرے نے اپنے شاگردوں کو دوسری قرأت کے مطابق پڑھایا تو ان اساتذہ کے شاگردوں میں باہم اختلاف ہونے لگا جو بالآخر ان کے اساتذہ تک پہنچا تو وہ بھی آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے صحابہ کرام سے بھرپور مشورے کے بعد ام المومنین حضرت حفصہؓ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور کا جمع شدہ قرآنی نسخہ منگوایا جو اس وقت بالاتفاق واحد معیاری نسخہ تھا۔ آپ نے چار اصحاب حضرت زیدؓ بن

ثابت، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعیدؓ بن العاص اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن حارث بن ہشام پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی۔ اس میں حضرت زیدؓ بن ثابت کا تعلق انصار سے اور باقی حضرات کا مہاجرین سے تھا۔ ان حضرات کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ مصحف صدیقی کی نقول تیار کریں اور جہاں کسی لفظ کی کتابت میں اختلاف ہو تو اسے قریش کی لغت کے مطابق لکھیں، کیونکہ قرآن قریشی لغت میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ لفظ تابوت کی کتابت کے متعلق اختلاف ہوا تو اسے تابوہ کی بہ جائے لغتِ قریش پر تابوت لکھا گیا (۱۲۶/ ب) ان حضرات نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور کے نسخے کی سات نقول تیار کیں۔ دیگر تمام نسخے حضرت عثمانؓ نے تلف کرا دیئے (۱۲۶/ ج) وجہ یہ تھی کہ ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا اہتمام نہیں تھا، سورتوں کی ترتیب بھی نہیں تھی اور کئی حضرات نے قرآنی آیات میں تفسیری کلمات اور عبارتوں کا اضافہ بھی اپنی یادداشت کے لئے کر رکھا تھا۔ مثلاً حضرت ابیؓ بن کعب کے مصحف میں سورہ احزاب کی آیت ''اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّھٰتُھُمْ'' کے بعد ''وھو ابھم'' یعنی وہ پیغمبر ﷺ ان (مسلمانوں) کے (روحانی) باپ ہیں، کے کلمات بہ طور تفسیر لکھے ہوئے تھے۔ امت میں اختلافات کو ختم کرنے کے لئے یہ اقدام ناگزیر تھا کہ ایسے تمام نسخے تلف کر دیئے جائیں (۱۲۷/ الف) قرآن کریم کی تیار کردہ ان سات نقول میں سے ایک نقل حضرت عثمانؓ نے اپنے پاس رکھی اور ایک ایک نقل مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ میں بھیج دی (۱۲۷/ ب) مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ اگرچہ اصل جامع القرآن حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں لیکن حضرت عثمانؓ کو جامع القرآن اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پوری امت کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور والے معیاری نسخے اور اس کی نقول کی قرأت پر متفق کر دیا۔ مصحفِ صدیقی میں سورتوں کو ترتیب نہیں دی گئی تھی لیکن مصاحفِ عثمانی میں سورتوں کو بھی مرتب کیا گیا۔ قرآنی آیات کی ترتیب تو بالاتفاق توقیفی یعنی رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے لیکن سورتوں کی ترتیب جمہور کے نزدیک توقیفی اور بعض کے خیال میں اجتہادی ہے۔ ان مصاحف میں آیات اس طرح لکھنے کا اہتمام کیا گیا کہ رسم الخط میں تمام متواتر قرأتیں سما جائیں۔ اسی لئے نہ ان پر نقطے لگائے گئے اور نہ ہی ان پر اعراب یعنی زبر، زیر اور پیش لگائے گئے تاکہ انہیں تمام متواتر قرأتوں کے مطابق پڑھا جا سکے مثلاً ''سَرھا'' لکھا تاکہ اسے ''نُنْشِزُھَا'' اور ''نَنْشِزُھَا'' دونوں طرح پڑھا جا سکے کہ یہ دونوں قرأتیں صحیح ہیں (۱۲۷/ ج) ابن ابی داؤد نے صحیح سند کے ساتھ سوید بن غفلہ سے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ تم عثمانؓ کے بارے میں اچھی بات ہی کہو۔ اللہ کی قسم، انہوں نے مصاحف (قرآنی نسخوں) کے بارے میں ہم جیسے لوگوں کی ایک بڑی جماعت کے تعاون اور مشورے سے ہی ایسا کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ

اگر اس وقت میں حاکم ہوتا تو قرآن کے بارے میں وہی کچھ کرتا جو عثمان نے کیا۔ نیز انہی ابن ابی داؤد نے عمدہ سند سے عبد خیر سے یہ روایات بیان کی ہے کہ میں نے حضرت علیؓ کو یہ فرماتے سنا کہ مصاحف (قرآنی نسخوں اور سورتوں) کے بارے میں سب لوگوں سے زیادہ اجر ابوبکرؓ کو حاصل ہے۔ اللہ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے کہ (رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد) انہوں نے ہی سب سے پہلے قرآن کو جمع فرمایا۔ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کے ادوار میں جمع کئے گئے مصحفِ صدیقیؓ اور مصحفِ عثمانی کو حضرت علیؓ نہایت قدر کی نظر سے دیکھتے تھے (۱۲۸/ الف) حضرت عثمانؓ کے اس کام کو بہ شمول حضرت علیؓ سب ہی نے بہترین کارنامہ قرار دیا صرف حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو اس بنا پر رنجش ہوئی کہ اس کام میں میری بہ جائے حضرت زیدؓ بن ثابت کو کیوں شامل کیا گیا ہے حالانکہ جس زمانے میں میں نے اسلام قبول کیا تھا اس وقت تو زید بن ثابت اپنے کافر باپ کی پشت میں بھی نہیں تھے (۱۲۸/ ب) صحابہ کرامؓ دنیوی امور میں نہیں بلکہ دینی کاموں میں مسابقت پر حریص تھے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو یہ رنج ہوا کہ انہیں قرآن کریم کی اس خدمت میں شریک نہیں کیا گیا ہے ورنہ ان کا مصاحفِ عثمانی سے کوئی اختلاف نہیں تھا جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ کئی متواتر قرأتوں کی سند حضرت عبداللہؓ بن مسعود تک پہنچتی ہے۔ چونکہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کوفے میں منتقل ہو گئے تھے اس لئے جمع و تدوین قرآن کے لئے ان کی خدمات سے استفادہ مشکل تھا اسی لئے انہیں متعلقہ کمیٹی میں شامل نہ کیا گیا تھا۔ علامہ ذہبی نے طبقات القرآ میں صحابہ کرام میں سے مشہور سات قرآء اور حفاظ کا نام لکھا ہے جن تک قاریوں کی سند پہنچتی ہے۔ ان میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود بھی شامل ہیں۔ دیگر حضرات میں عثمانؓ بن عفان، علی ابن ابی طالب، ابی بن کعب، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، ابو حذیفہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ ان میں حضرت ابیؓ بن کعب سیّد القرآء ہیں (۱۲۸/ ج)

قبل ازیں مذکور ہو چکا ہے کہ مصحف صدیقی کی نقول تیار کرنے کے لئے حضرت عثمانؓ نے چار حضرات کی ایک کمیٹی مقرر فرمائی تھی۔ بعد میں ان حضرات کے ساتھ بعض اور صحابہ کرامؓ کو بھی لگا دیا گیا تھا جن میں حضرت ابی بن کعب، حضرت کثیر بن افلح، حضرت مالک بن ابی عامر، حضرت انس بن مالک اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔ یہاں تک کہ ابن ابی داؤد کی روایت کے مطابق ان حضرات کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی تھی (۱۲۹/ الف) ان نقول کی تیاری میں انہی صحیفوں یعنی الگ الگ لکھی گئی قرآنی سورتوں کو ملحوظ رکھا گیا تھا جو عہد صدیقی میں لکھی گئی تھیں۔ مزید احتیاط کے لئے حسبِ ضرورت وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں ملحوظ رکھا گیا تھا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ رسول اکرم ﷺ ہر سال رمضان مبارک کے مہینے میں حضرت جبرئیلؑ سے قرآن کریم کا دور فرماتے تھے اور آپ

کی حیات طیبہ کے آخری رمضان میں یہ دور دو مرتبہ ہوا تھا۔ اس آخری دور کو ''عرضۂ اخیرہ'' کہا جاتا ہے۔ قرأتوں کے بہت سے اختلافات خصوصاً بدلیت یعنی قرأت میں مترادف اور ہم معنیٰ کلمات کا استعمال بڑی حد تک منسوخ ہو گئے تھے۔ اسی طرح منسوخ التلاوۃ آیات بھی اس عرضۂ اخیرہ میں شامل نہیں تھیں۔ تاہم قرأت کے جو اختلافات باقی رہ گئے تھے اور پھر متواتر قرأتوں سے امت تک منتقل ہوئے ان سب کو عثمانی مصاحف کے رسم الخط میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔

(ج) بعض شبہات کا ازالہ

۱۔ صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت کے مطابق چار اصحاب کے علاوہ کسی نے قرآن جمع نہیں کیا اور یہ سب انصار میں سے ہیں، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابوزید رضی اللہ عنہم۔ دوسری روایت میں حضرت ابیؓ بن کعب کی بہ جائے حضرت ابولدرداءؓ کا نام ہے (۱۲۹/ ب) اس روایت میں دور نبوی میں پورا قرآن جمع کرنے یعنی لکھنے والوں کے انصار صحابہ کرامؓ کا ذکر ہے۔ اس سے یہ مطلب کشید کرنا درست نہیں کہ دورِ نبوی میں قرآن کریم صرف چار اصحاب رسول نے ہی حفظ کر رکھا تھا۔ جمع قرآن اور حفظِ قرآن کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے۔ مذکورہ حضرات نے انفرادی طور پر پورا قرآن دور نبوی میں جمع کر رکھا تھا۔

۲۔ صحیحین اور سنن ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رات کے وقت ایک شخص کو نماز میں ایک سورت پڑھتے سنا تو فرمایا کہ اللہ اس پر رحم کرے اس نے مجھے فلاں آیت یاد دلا دی جو میں بھول گیا تھا (۱۲۹/ ج) بعض اوقات ایک چیز حافظے میں تو موجود ہوتی ہے لیکن ادھر توجہ نہیں ہوتی۔ دوسروں کے یاد دلانے سے فوراً حافظے میں تازہ ہو جاتی ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے حافظے میں ہی نہیں رہی تھی۔ اگر مارگولیس جیسے متعصب مستشرقین کی یہ بات بالفرض درست ہو کہ یہ آیت آپ کے حافظے میں نہیں رہی تھی تو بھی اس سے قرآن کریم کا محفوظ ہونا قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔ جب وہ آیت قرآن کریم کے ہزاروں حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھی تو بعض کے حافظے میں بالفرض باقی نہ رہی ہو تو اس سے عملاً کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اس سے تو قرآن کریم کے محفوظ ہونے پر مزید ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ اگر کسی کے حافظے سے بالفرض کوئی قرآنی آیت محو بھی ہو جائے تو دوسرے ہزاروں افراد کے حافظے میں اس کا باقی رہنا اس کی غیبی حفاظت پر زبردست دلیل ہے۔ کسی کا انفرادی طور پر اسے بھول جانا قرآن کریم کی متعلقہ آیت کی حفاظت پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا۔

۳۔ سورۂ اعلیٰ میں ہے کہ (اے پیغمبر!) ہم تجھے قرآن پڑھائیں گے پھر تو بھولے گا نہیں مگر جو اللہ (بھلانا) چاہے (۱۳۰/ الف) اور سورہ بقرہ میں ہے کہ ہم جس آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا فراموش کرادیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اس جیسی دوسری آیت لے آتے ہیں (۱۳۰/ ب) سورۂ اعلیٰ کے مضمون میں رسول اکرم ﷺ کو یہ یقین دلایا جارہا ہے کہ آپ ہرگز قرآن نہیں بھولیں گے کیونکہ ہم آپ کو پڑھا رہے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کچھ بھلانا چاہے تو وہ (معاذ اللہ) اس پر قادر نہیں رہا۔ چنانچہ وہ آیات نہ بھلانے کے اس وعدے سے مستثنیٰ کردی گئیں جن کی تلاوت اللہ تعالیٰ نے بعد میں خود منسوخ فرمادی اور سورہ بقرہ کی متعلقہ آیت کا مضمون بھی اسی کو ظاہر کررہا ہے کہ منسوخ التلاوۃ آیات حافظے سے محو کردی جائیں گی اور اگر کسی نے لکھ بھی رکھی ہوں تو اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا فرمادیں گے جن کے تحت وہ محفوظ نہ رہیں مثلاً حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ (زانی مرد وعورت کو) سنگسار کرنے کی آیت اور بڑے آدمی کو دس رضعات (دودھ کے دس گھونٹ پلانے) کی آیت نازل ہوئی تھی۔ یہ آیات میرے گھر میں ایک تخت کے نیچے کاغذ پر لکھی رکھی تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کے مرض وفات کی تکلیف شروع ہوئی تو ہم آپ کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ ہمارا ایک پالتو جانور تھا وہ آیا اور اس نے وہ کاغذ کھالیا (۱۳۰/ ج) یہ آیات منسوخ التلاوۃ تھیں اور ان کے منسوخ ہونے پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ جس طرح ایسی آیات قرآن کریم میں دی گئی اللہ تعالیٰ کی خبر کے عین مطابق حافظوں سے محو کردی گئی تھیں اسی طرح لکھی ہوئی بھی محفوظ نہ رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ نے کسی منسوخ التلاوۃ آیت کا اپنی کسی روایت میں مثلاً آیتِ رجم کا حوالہ دیا ہے اور اپنی طرف سے اس آیت کے کلمات ادا کرنے کی کوشش کی ہے تو اس میں انہیں پوری کامیابی نہیں ہوئی اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ان کلمات کا پایہ قرآن کریم سے بہت فروتر ہے۔ لہٰذا بعض متعصب مستشرقین کا سورۂ اعلیٰ کی مذکورہ بالا آیت سے یہ مطلب کشید کرنا ہرگز درست نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو (معاذ اللہ) کئی قرآنی آیات بھول گئی ہوں گی۔ ہاں جو منسوخ التلاوۃ آیات اللہ تعالیٰ نے خود رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کی یادداشت سے محو کرنی تھیں، وہ ضرور محو ہوئیں۔ اس سے قرآن کریم کی حفاظت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

۴۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی طرف بعض روایات منسوب ہیں کہ وہ سورہ فاتحہ اور معوذتین کو قرآن کریم میں شامل نہیں سمجھتے تھے اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اہلِ علم کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اگر کوئی روایت بالفرض باعتبارِ سند صحیح بھی ہو لیکن کسی متواتر روایت کے خلاف ہو تو دونوں میں تطبیق دی جائے گی اور تطبیق ممکن نہ ہونے کی صورت میں اسے یک سر نظر انداز کیا جائے گا اور اسے معلول

قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ یہاں بھی تاویل یہ کی گئی ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو ان بہ صورتوں کے منزل من اللہ (اللہ کی طرف سے بہ ذریعہ وحی اتاری گئی) ہونے سے انکار نہیں تھا لیکن وہ اسے مصحف یعنی مکتوبی قرآن میں اس لئے شامل نہیں کرتے تھے کہ سورۂ فاتحہ تو نماز کی ہر ایک رکعت میں پڑھی جاتی ہے لہٰذا اس کے ضائع ہونے یا اس کے بھول جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور معوذتین جھاڑ پھونک کے لئے نازل ہوئی ہیں اس لئے انہیں مصحف میں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اور کتاب اللہ سے آپ کی یہی مصحف مراد ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ روایت سرے سے قابلِ قبول ہی نہیں کیونکہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی طرف منسوب ایسی روایات ان قرأتوں کے خلاف ہیں جو حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے تواتر سے منقول ہیں بلکہ خود حضرت عبداللہ بن مسعود نے معوذتین کا بہ ذریعہ وحی نازل ہونا روایت کیا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب درّ منثور میں لکھتے ہیں کہ طبرانیؒ نے المعجم الاوسط میں عمدہ سند کے ساتھ ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا لقد انزل علی آیات لم ینزل مثلھن المعوذتین ''مجھ پر ایسی آیات نازل ہوئیں کہ ان کی مثل پہلے کبھی نازل نہیں ہوئیں اور یہ معوذتین ہیں'' (۱۳۱/ الف) اس صورت میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود معوذتین کے قرآن ہونے کا کیسے انکار کر سکتے تھے؟ امام نووی شارحِ صحیح مسلم نے اپنی کتاب شرح المہذب میں، علامہ ابن حزمؒ نے اپنی کتاب محلّٰی میں اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں اور علامہ بحر العلوم فرنگی محل نے شرح مسلّم الثبوت میں حضرت ابن مسعودؓ کی طرف منسوب ایسی تمام روایات کو جھوٹ قرار دیا ہے (۱۳۱/ ب)

الغرض حضرت ابن مسعودؓ یقیناً سورہ فاتحہ اور معوذتین کو بہ ذریعہ وحی نازل شدہ قرآنی آیات سمجھتے تھے چنانچہ عاصم کی زِرّ بن حبیش اور زرّ کی ابن مسعودؓ سے جو قرأت چلی آرہی ہے اس میں معوذتین اور فاتحہ شامل ہیں۔ اور قرآنی سورتوں کی ترتیب بھی وہی ہے جو مصحف عثمانی میں ملحوظ رکھی گئی تھی۔

۵۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کے ادوار خلافت میں قرآن کریم کی جمع وتدوین سے متعلق بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ سورہ توبہ کی آخری دو آیات اور سورۂ احزاب کی آیت مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ سے ملی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہؓ کی شہادت کو دو مردوں کی شہادت کے برابر قرار دیا تھا۔ (۱۳۱/ ج) اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قطعاً غلط ہے کہ صحابہ کرامؓ کے لئے یہ آیات کوئی نو دریافت گم شدہ آیات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کا اپنا قول ہے کہ میں نے قرآن مکتوبی ذرائع کے علاوہ حفاظِ قرآن کے سینوں سے بھی اکٹھا کیا۔ یہ آیات لاتعداد صحابہ کرامؓ کے سینوں میں محفوظ تھیں۔ ان کی نمازوں وغیرہ میں

تلاوت ہوتی رہتی تھی اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھائے ہوئے قرآن کریم میں بھی موجود تھیں البتہ جن لوگوں نے انفرادی طور پر قرآنی آیات متفرق پارچوں پر لکھ رکھی تھیں ان میں صرف حضرت خزیمہؓ ایسے صحابی تھے جن کے پاس مذکورہ آیات لکھی ہوئی ملیں۔ دوسروں نے لکھی بھی ہوں تو اتفاقاً انہیں مل نہ سکیں اس سے قرآن کریم کا محفوظ ہونا ہرگز متاثر نہیں ہوتا۔ بلکہ حسنِ اتفاق سے یہ صورت حال اس لئے پیدا ہوگئی کہ حضرت خزیمہؓ کی شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ مبارک کی تعمیل میں دو مردوں کی شہادت کے برابر سمجھا جائے۔

۶۔ حضرت عثمانؓ کی طرف ایک غلط روایت منسوب ہے کہ کتابت کے بعد جب مصاحف آپ پر پیش کئے گئے تو آپ نے فرمایا اِنَّ فی القرآن لحناً ستقیمہ العرب بالسنتھم (۱۳۲/الف) قرآن میں لحن ہے جسے عرب اپنی زبانوں سے درست کرلیں گے''۔ علامہ آلوسی تفسیر روح المعانی میں اس روایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ روایت حضرت عثمانؓ سے ثابت ہی نہیں۔ نیز لحن کا ایک معنیٰ ''غلطی'' ہے اور دوسرا معنیٰ ''طرزِ کلام'' ہے۔ اگر بالفرض مذکورہ روایت صحیح بھی ہو تو یہاں لحن کا یہ معنیٰ ہوگا کہ قرآنی کلمات بعض عربوں کی زبان پر چڑھے ہوئے نہیں لیکن انہیں بار بار پڑھنے سے وہ ان کے صحیح تلفظ پر قادر ہوجائیں گے۔ قرآن کریم میں منافقین کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ہے وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ، (۱۳۲/ب) ''اور (اے پیغمبر!) تو انہیں ان کی بات کے ڈھب سے ہی ضرور پہچان لے گا۔

۷۔ اگر کوئی شخص مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے (معاذ اللہ) تحریفِ قرآن کا قائل ہو تو کبھی بھی ایسے منافقین کو امتِ مسلمہ کا حصہ شمار نہیں کیا گیا۔ جہاں تک قرأتوں کے اختلاف اور بعض آیات یا سورتوں کے منسوخ ہونے کا تعلق ہے تو یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ متکلم اپنے کلام میں خود کوئی تبدیلی یا ترمیم کرے یا ترتیب کو بدلے تو اسے تحریف کا نام دینا ہی غلط ہے۔ تحریف یہ ہے کہ کوئی اور شخص متکلم کے کلام میں اپنی طرف سے کمی بیشی کرے، ترمیم کر ڈالے یا اپنی طرف سے ترتیب بدل ڈالے۔ بائبل کے عین برعکس قرآن کریم اس عیب سے پاک ہے۔

۸۔ پوری امت مسلمہ شروع سے متفق چلی آرہی ہے کہ صرف وہی قراءتیں معتبر ہیں جو نہ صرف عثمانی مصاحف کے رسم الخط میں سما سکتی ہوں اور عربی قواعد کے مطابق ہوں بلکہ ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر طریقے سے پڑھنا بھی ثابت ہو یا کم از کم ایسی صحیح سند سے ثابت ہو کہ وہ قرأت مسلمہ علمائے قرأت میں مشہور و معروف ہو۔ جو قرأتیں غیر معتبر ہیں وہ قرآتِ شاذہ میں شامل ہیں اور معتبر

قرأتوں کے مقابلے میں ہرگز مقبول نہیں ہیں۔ اس لئے ایسی شاذ قرأتوں کی بنا پر مستشرقین کے اعتراضات سرے سے لائق توجہ نہیں ہیں۔ ہم نے بائبل کی جمع وتدوین پر جو قوی اور ناقابلِ تردید اشکالات پیش کئے ہیں، ان کی بنیاد ہم نے ہرگز ایسی کتابوں اور ایسے مضامین پر نہیں رکھی جنہیں اہل کتاب معتبر نہ سمجھتے ہوں یا جن کے معتبر اور صحیح ہونے کے متعلق ان میں باہم اختلاف ہو، مثلاً انجیل برناباس کا ہم نے کوئی حوالہ نہیں دیا اور بائبل کی جن کتب کو پروٹسٹنٹ چرچ صحیح نہیں سمجھتا انہیں بھی ہم نے مکمل نظر انداز کیا ہے۔ ہم نے بائبل کے شارحین اور مفسرین کا سوائے آدم کلارک کے ایک حوالے کے اور کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، وہاں بھی آدم کلارک کے حوالے کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو بھی ہمارا استدلال چنداں متاثر نہیں ہوتا۔ اس لئے اہل کتاب کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ وہ شاذ قرأتوں کا سہارا لے کر قرآن کریم کی حفاظت کو مشتبہ ٹھہرانے کی کوشش کریں یا کسی خبر واحد کو خبرِ متواتر کے مقابلے ومعارضے میں پیش کریں۔ قرآن کریم کی تفاسیر میں بھی رطب ویابس سب کچھ موجود ہے اس لئے کوئی موضوع، ضعیف، معلول اور شاذ روایت قبول نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ صحیح خبرِ واحد کو بھی خبرِ متواتر کی تائید میں تو لایا جاسکتا ہے، مقابلے اور معارضے میں نہیں لایا جاسکتا۔

۹۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کے جو نسخے تیار کرائے تھے وہ نقطوں اور اعراب سے خالی تھے۔ اس سے بعض مستشرقین کا یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے کہ قرآن کریم کی قرأتوں کا اختلاف ان نسخوں کے غیر منقوط ہونے اور ان پر اعراب نہ ہونے کی وجہ سے ہوا۔ قرآن کریم کی حفاظت کی اولین صورت اس کی صدری اور قلبی حفاظت تھی۔ یہ بے شمار صحابہ کرامؓ کے سینوں میں محفوظ تھا اور اس کی نمازوں میں اور ویسے بھی تلاوت بہ کثرت ہوتی تھی اور تلاوت کا یہ سلسلہ امت مسلمہ میں کبھی منقطع نہیں ہوا۔ دور نبوی میں قرآن کی کتابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی تلاوت کے تابع ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین وحی کو جب قرآنی آیات لکھاتے تھے تو پہلے آپ ان کی تلاوت فرماتے تھے تب ہی تو وہ لکھی جاسکتی تھیں۔ قرآن کریم کے سات حروف پر نازل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کی سہولت کے لئے قرأتوں میں اختلاف کی گنجائش رکھی گئی تھی نہ یہ کہ یہ اختلاف حضرت عثمانؓ کے زمانے میں تقریباً ۲۵ ہجری میں تیار کرائے گئے ان نسخوں کی وجہ سے ہوا۔ سات حروف پر قرآن کے نازل ہونے یا سات طرح کے قرأتوں کے اختلاف کی تشریح میں جو اہل علم کا اختلاف ہے، اس سے بھی قرآن کریم کی حفاظت متاثر نہیں ہوئی کیونکہ قرأتوں کا اختلاف بعد میں بہ تدریج گھٹتا چلا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کے ادوار میں قرآن کریم کی جمع وتدوین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری

رمضان کے عرضۂ اخیرہ (حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ قرآن کے دومرتبہ آپ کے آخری دور) کوملحوظ رکھا گیا تھا۔ جوتھوڑا بہت معمولی اختلاف باقی رہ گیا تھا وہ عجمیوں کے لئے مسائل اور مشکلات پیدا کررہا تھا۔ اسی لئے ان اختلافات کوختم کرنے کے لئے عرضۂ اخیرہ کی قرأت کے مطابق قرآنی نسخے مرتب کئے گئے۔

۱۰۔ بائبل اور قرآن کریم کی جمع وتدوین کے تقابل میں اہل کتاب کواس پر بھی خوب غور کرنا چاہئے کہ بمطابق بائبل حضرت موسیٰؑ نے تورات کا نسخہ خود لکھ کر صندوقِ شہادت میں رکھوایا تھا اور آپ نے اپنی قوم بنی اسرائیل کی بغاوت وسرکشی پر اظہار خیال فرمایا تھا کہ میری زندگی میں جب تمہارا یہ حال ہے تو تم بعد میں کیا کچھ نہیں کروگے۔ نیز تورات کے اس نسخے کی لوگوں کے سامنے تلاوت کہیں سات سالوں کے بعد جا کر ہوا کرتی تھی (۱۳۲/ ج) اس کے برعکس قرآن کریم کا کوئی ایک لفظ بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے نہیں لکھا بلکہ سارا قرآن کاتبین وحی سے لکھوایا گیا۔ اس دور میں کاغذ اگرچہ کم یاب تھا لیکن نایاب ہرگز نہیں تھا۔ آپ چاہتے تو پورے قرآن کو ہڈیوں، تختیوں، پتوں اور کپڑے وغیرہ پر لکھانے کی بہ جائے بہرصورت کاغذ منگوا کر اس پر لکھاتے اور اپنی حیات طیبہ میں ہی اسے یک جا کروا کر اپنے اصحاب کے حوالے کر جاتے۔ لیکن ایسا اس لئے نہیں کیا گیا کہ بعد کے لوگ اس وسوسے کے قریب بھی نہ پھٹکیں کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اصحاب پر (معاذ اللہ) ایسے ہی اعتماد نہیں تھا جیسے حضرت موسیٰؑ کو اپنی قوم پر ہرگز نہیں تھا۔ چنانچہ اگر ہم متعصب مستشرقین کے ان غلط مفروضات کو تھوڑی دیر کے لئے صحیح تصور کرلیں کہ دورِ نبوی میں قرآن کریم لکھا ہی نہیں گیا تھا یا پورا نہیں لکھا گیا تھا اس لئے بہت سی آیات بعد میں قرآن کریم میں بہ قول ان کے شامل نہیں کی جاسکی ہوں گی، تو بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سورہ نساء میں ہے کہ جو شخص رسول ﷺ کی مخالفت کرے بعد اس کے کہ ہدایت اس پر واضح ہوچکی (اگر وہ خود غور نہ کرے اور سمجھنا نہ چاہے یا ضد اور تعصب سے کام لے تو اس کا اپنا قصور ہے) اور تمام مومنین کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور راستے کی پیروی کرے تو ہم اس کا رخ ادھر ہی کردیں گے جدھر اس نے اپنا رخ خود کرلیا ہے اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ (۱۳۳/ الف) دیکھئے یہاں مخالفتِ رسول ہی پر جہنم کی وعید نہیں سنائی گئی بلکہ ساتھ مومنین کے راستے پر نہ چلنے کو بھی مخالفتِ رسول ہی قرار دیا گیا اور نزولِ قرآن کے موقع پر مومنین صرف اصحابِ رسول ہی تو تھے۔ اس لئے صحابہ کرامؓ کا جس بات اور جس کام پر اجماع ہوجائے تو اسے رسول ﷺ ہی کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ مصاحفِ عثمانی پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہی اس بات پر زبردست دلیل ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی اور منشا کے عین مطابق ہے۔ اس لئے جو آیات حضرت عثمانؓ کے مصاحف میں شامل نہیں

ہوسکیں وہ یقیناً اور لازماً ایسی آیات تھیں جن کی تلاوت منسوخ ہوچکی تھی اور ان کا شامل نہ کیا جانا ہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی اور خواہش کے عین مطابق تھا۔

۱۱۔ بائبل کے اندر کے مضامین ہی چیخ چیخ کر بول رہے ہیں کہ بائبل محرّف اور ناقابل اعتماد ہے۔ اس کے برعکس قرآن کریم میں ہے کہ ہم نے ہی اس نصیحت کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں (۱۳۳/ب) اور مثلاً سورہ حم السجدہ میں ہے کہ یہ عزت والی کتاب ہے جس پر باطل کا سامنے یا پیچھے سے گزر نہیں ہوتا۔ یہ حکمت والے اور تعریف کے لائق (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے اتارا ہوا ہے (۱۳۳/ج) قرآن کریم کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی، چنانچہ یہ طبقاتی تواتر سے آئندہ نسلوں تک منتقل ہوا ہے۔ قرآن کریم کتابت کے علاوہ ہر دور میں سینہ بہ سینہ بھی آئندہ نسلوں تک منتقل ہوا اور کسی بھی دور میں حفظ کا یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا بلکہ ہر دور میں لاتعداد مسلمانوں نے اسے زبانی یاد کیا۔ بے شمار مساجد میں عام نمازوں میں عموماً اور رمضان المبارک میں نماز تراویح میں خصوصاً اس کی زبانی تلاوت اور اسے سننے کا نہایت عظیم الشان اور روح پرور اہتمام صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ مدارس میں قاری حضرات قرآن کریم کی متعدد قرأتوں مثلاً سات اور دس طرز کی مشہور و معروف قرأتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ قرآنی حروف کے مخارج اور ان کی صحیح ادائیگی کے طریقے بتاتے ہیں۔ حسن قرأت کی تقریبات چلتی رہتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی جن کی مادری زبان عربی نہیں ہوتی اور جو اس کے معنی و مفہوم سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں وہ بھی اسے فرفر یاد کر لیتے ہیں۔ اس کی ناظرہ تلاوت بھی بہت کثرت سے ہوتی ہے۔ اسے اتنا پڑھا جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی اور کتاب اس بہتات اور اس محبت و عقیدت سے ہرگز نہیں پڑھی جاتی۔ یہ اسم بامسمّیٰ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے کی عربی زبان کو اس طرح زندۂ جاوید بنا دیا اور یوں محفوظ کر دیا کہ گو اس میں مزید بے شمار الفاظ اور تراکیب کا اضافہ ہوا ہے لیکن قرآن کے نزول کے زمانے کی عربی بھی تروتازہ اور زندہ ہے۔ اس نے دوسری زبانوں مثلاً فارسی اور اردو وغیرہ پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ قرآنی مادوں سے مشتق بے شمار الفاظ و کلمات ان زبانوں میں مستعمل ہیں۔ مثلاً آیت اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہی کو لیجئے۔ نزول، تنزیل، نازل، انزال، منزل، منزلت وغیرہ الفاظ اب بھی مستعمل ہیں۔ ذکر، تذکیر، تذکرہ، ذاکر، مذکور اسی طرح حفاظت، حافظ، محافظ، محفوظ، حفظ، حافظہ وغیرہ الفاظ بہ کثرت استعمال میں آتے ہیں۔ قرآن کریم نے دور جاہلیت کی شاعری کے ایک حصے کو بھی محفوظ کر دیا۔ دوسری زبانوں کے آج سے چند سو سال پہلے کے بے شمار الفاظ آج متروک ہیں۔ انگریزی زبان ہی کو لیجئے۔ چاسر اور سپنسر کے زمانے کی انگریزی دور حاضر کی انگریزی سے بہت مختلف ہے

جیسا کہ چاسر کی کتاب ''کینٹر بری ٹیلز'' اور سپنسر (Spencer) کی کتاب ''فیری کوئین'' کے مطالعے سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ غیر مسلم خوب غور کریں دنیا میں کسی بھی آسمانی کتاب کی ایسی غیبی انداز سے حفاظت کسی بھی دور میں نہیں ہوئی جیسے قرآن کریم کی ہوئی ہے۔ یہ تو قرآن کا حال ہے اور صاحبِ قرآن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کروڑوں مرتبہ نمازوں میں اور اس کے علاوہ بھی روزانہ نہایت ہی محبت وعقیدت اور احترام وعظمت سے صلوٰۃ وسلام بھیجا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی اس اعجازی شان کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہوئے بھی کوئی اس کے محفوظ اور غیر محرف ہونے کا انکار کرے تو یقیناً اس نے ضد اور تعصب کے ہتھیاروں سے لیس ہوکر ''میں نہ مانوں'' کی قسم اٹھا رکھی ہے۔

۱۲۔ بعض مستشرقین نے قرآن کریم کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے حالات اور ان کی بت پرستی پر نہایت نالاں تھے اور ان کی اصلاح کے لئے تدابیر کی سوچ میں اس قدر مستغرق رہتے تھے کہ آپ کے اندر کی آواز اور ضمیر کی پکار آپ کی زبان پر کلمات جاری کردیتی تھی، حالانکہ بہ قول ان مستشرقین کے یہ خارجی اور حقیقی وحی نہ تھی لیکن آپ (معاذ اللہ) غلطی سے اسے وحی سمجھتے تھے۔ اور کچھ مستشرقین نے کتب حدیث میں مذکور آپ پر نزول وحی کی کیفیات کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) مرگی جیسا کوئی ذہنی مرض قرار دیا ہے۔ محض ضمیر کی پکار یا کسی ذہنی مرض کی بنا پر کسی سے صادر ہونے والا کلام ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا کہ لوگ اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہوں۔ قرآن کریم کے معجزہ ہونے کی جو گوناگوں حیثیتیں (وجوہِ اعجاز) ہیں ان میں سے صرف اخبار عن المغیبات یعنی ماضی، حال اور مستقبل کی جو غیبی خبریں قرآن نے دی ہیں اور جنہیں ہم اس سلسلۂ مضامین میں خوب واضح کرتے آئے ہیں، انہی پر نظر ڈالنے سے ان مستشرقین کا خود فریبی میں مبتلا ہونا نمایاں ہوجاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ (اے پیغمبر!) تو (ان لوگوں سے) کہہ دے کہ میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے لئے (ضد اور خود فریبی چھوڑ کر) دو دو مل کر یا تنہا تنہا کھڑے ہوکر سوچو تو سہی (تو تمہیں صاف معلوم ہوجائے گا کہ) تمہارے اس رفیق کو کوئی جنون نہیں۔ وہ تو تمہیں ایک بڑے عذاب کے آنے سے پہلے ڈرانے والا ہے (۱۳۴/ الف) اور مثلاً سورۂ مومنون میں ہے کہ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر!) کو جنون ہے؟ بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا ہے ہاں! ان میں اکثر حق کو پسند نہیں کرتے۔ اور اگر حق ان (اہل باطل) کی خواہشات کی پیروی کرے تو آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں سب درہم برہم ہوجائیں بلکہ ہم نے ان کے پاس ان کی نصیحت کی کتاب پہنچادی ہے اور وہ اپنی نصیحت (یعنی اس کتاب) سے منہ پھیر رہے ہیں۔ (۱۳۴/ ب) دل کا اندھا کون ہے اور کس کی عقل پر پتھر پڑے ہوئے ہیں، اس سلسلے میں قرآن کریم میں

مثلاً سورۂ حج میں ہے کہ بات یہ ہے کہ (ظاہری) آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں جو سینوں میں ہیں (۱۳۴/ ج) اور مثلاً سورۂ رعد میں ہے کہ بھلا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے وہ حق ہے، کیا وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اندھا ہے؟ صرف عقل مند لوگ ہی سمجھا کرتے ہیں (۱۳۴/ الف) اور مثلاً سورۂ اسراء/ بنی اسرائیل میں ہے کہ جو شخص اس دنیا میں (عقل کا) اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور سیدھی راہ سے بہت ہٹا ہوا ہوگا (۱۳۵/ ب) اور مثلاً سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جو شخص میری یاد سے غافل رہا اس کی (برزخی) زندگی تنگی میں رہے گی اور ہم اسے بروز قیامت اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا، اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو دیکھتا بھالتا تھا (جواب ملے گا) اسی طرح ہونا چاہئے تھا تو میری آیتوں کو بھول گیا تھا تو آج تجھے بھی بھلا دیا گیا ہے ہم ایسا ہی بدلہ ہر اس شخص کو دیا کرتے ہیں جو حد سے گزر جائے اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہ لائے اور بلاشبہ آخرت کا عذاب نہایت ہی سخت اور باقی رہنے والا ہے (۱۳۴/ ج)

اس کے باوجود اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) مرگی زدہ اور مجنون کہنے والے بعض متعصب اہل کتاب سمجھ نہیں پائے اور انہیں واقعی ذہنی مریضوں کی تلاش ہے تو ان کے لئے صرف ''مقدس بائبل'' کا مطالعہ ہی بڑا مفید رہے گا۔ ہم انشاء اللہ العزیز انہیں یہ مطالعہ ''مجنون کون ہے''؟ کے عنوان کے تحت آئندہ صفحات میں کرائیں گے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ (الف) انجیل متی ۱:۱۸۔۲۳، لوقا ۱:۲۶۔۳۵ (ب) متی ۱:۱۶، لوقا ۳:۲۳۔۳۸ (ج) لوقا ۷:۱۲۔۱۷

۲۔ (الف) یوحنا ۱۱:۴۱۔۴۶ (ب) متی ۹:۱۸، ۲۴ (ج) مرقس ۵:۲۳، ۳۵، ۳۹، لوقا ۸:۴۲، ۴۹، ۵۳

۳۔ (الف) کتاب اعمال ۲۶:۲۲۔۲۳ (ب) ۱۔کرنتھیوں ۱۵:۲۰ (ج) انگریزی بائبل۔ ایضاً

۴۔ (الف) کلسیوں ۱:۱۸ (ب) گڈ نیوز بائبل۔ ایضاً (ج) مشاہدات یوحنا ۱:۵

۵۔ (الف) گڈ نیوز بائبل۔ ایضاً (ب) مجلّہ السیرۃ شمشاہی عالمی۔ شمارہ نمبر ۱۸، رمضان المبارک ۱۴۲۸ھ/ ستمبر ۲۰۰۷ء۔ حاشیہ صفحہ ۱۸۱ نکتہ نمبر ۲۰، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز۔ ناظم آباد نمبر ۴۔ کراچی۔ (ج) لوقا ۲۴:۶۔۷

۶۔ (الف) ۱۔کرنتھیوں ۱۵:۳۔۴ (ب) گڈ نیوز بائبل۔ ایضاً (ج) مجلّہ السیرۃ شمشاہی عالمی۔ شمارہ نمبر ۲۰، رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ ستمبر ۲۰۰۸ء۔ صفحہ ۱۳۴۔۱۵۰

۷۔ (الف) انجیل یوحنا ۲:۱۔۱۱ (ب) ایضاً ۵:۸ (ج) لوقا ۱۱:۱۷۔۱۹

۸۔ (الف) متی ۲۰: ۲۹۔۳۰، مرقس ۱۰: ۴۶۔۵۲ (ب) مرقس ۷: ۳۲۔۳۵، متی ۱۵: ۳۰۔۳۱ (ج) متی ۸: ۲۸، مرقس ۵: ۲، لوقا ۸: ۲۷

۹۔ (الف) متی ۱۵: ۲۲، مرقس ۷: ۲۵۔۲۶ (ب) مجلّہ السیرۃ عالمی شمارہ نمبر ۱۹، ربیع الاول ۱۴۲۹ھ، مارچ ۲۰۰۸ء۔ صفحہ ۱۵۴ از یرعنوان ''مسیحیت یسوع اور اناجیل'' (ج) مجلّہ السیرۃ عالمی شمارہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ/ستمبر ۲۰۰۸ء، عنوانات ''معیارِ ایمان'' صفحات ۹۷۔۱۰۲ ''جنت کا استحقاق'' صفحات ۱۲۶۔۱۳۴

۱۰۔ (الف) آل عمران: ۴۴۔۴۷ (ب) ایضاً: ۴۹۔۵۱ (ج) المائدہ: ۱۱۰

۱۱۔ (الف) مریم: ۲۹۔۳۰ (ب) حضرت عیسیٰؑ کو اپنے صاحبِ کتاب نبی ہونے کا علم بچپن سے ہی ہو گیا تھا اس سے ان کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ کسی کو کسی بات کا پیشگی علم ہو جانا بلکہ کسی کو کسی بھی نعمت کا جلد حاصل ہو جانا اس امر پر دلیل نہیں کہ وہ لازماً ہر حال میں دوسروں سے افضل ہے۔ بلکہ اگر کسی کو کوئی خاص نعمت حاصل ہو جائے جو دوسروں کو نہ دی گئی ہو تو اس سے بھی اس کی دوسروں پر کلی فضیلت ثابت نہیں ہوتی مثلاً، حضرت یوحنا (یحییٰؑ) کے متعلق انجیل لوقا میں ہے ''کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا......اور اپنی ماں کے بطن ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا''۔ (لوقا۔ ۱: ۱۵) دیکھئے حضرت یوحنا تو ماں کے پیٹ ہی سے روح القدس سے بھرے ہوئے تھے لیکن اسی انجیل لوقا میں ہے کہ حضرت یسوعؑ پر روح القدس کا کبوتر کی صورت میں نزول اس وقت ہوا تھا جب آپ نے حضرت یوحنا سے بپتسمہ (روحانی غسل) کیا۔ اس وقت آپ کی عمر کوئی تیس برس کے قریب تھی (لوقا۔۳: ۲۱۔۲۳) اس سے حضرت یوحنا کا حضرت یسوعؑ (عیسیٰؑ) سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ نیز دیکھئے، بہ مطابق کتاب خروج حضرت موسیٰؑ کو خدا نے یہ معجزہ عطا فرمایا تھا کہ جب خدا کے حکم سے آپ نے اپنی لاٹھی زمین پر پھینکی تو وہ سانپ بن گئی اور پھر جب اسے خدا کے حکم سے دُم سے پکڑا تو وہ سانپ دوبارہ لاٹھی بن گیا (خروج ۴: ۲۔۴) اس طرح کا معجزہ حضرت یسوعؑ سمیت کسی اور نبی کے لئے ثابت نہیں لیکن اس کے باوجود عیسائی حضرات حضرت موسیٰؑ کو حضرت یسوعؑ سے افضل نہیں گردانتے۔ سمسونؑ ایک اسرائیلی نبی ہیں جو خدا کی قدرت سے منوحہ کی بانجھ بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ خدا کے ایک فرشتے نے منوحہ کی بانجھ بیوی کو بشارت دیتے ہوئے کہا تھا ''وہ لڑکا پیٹ ہی سے خدا کا نذیر ہوگا''

(قضاۃ ۱۳: ۵) پولس عبرانیوں کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے ''اتنی فرصت کہاں کہ جدعون اور برق اور سمسون اور افتاہ اور داؤدؑ اور سموئیل اور اور نبیوں کے احوال بیان کروں'' (عبرانیوں ۱۱: ۳۲) ان مضامین سے سمسون کا نبی ہونا اور ماں کے پیٹ ہی سے خدا کا نذیر ہونا معلوم ہوا۔ اس کے برعکس مثلاً حضرت موسیٰؑ کو اپنی نبوت کے ظہور کا وقت معلوم نہیں تھا۔ جب یہ ظہور ہوا تو وہ بہ مطابق بائبل شادی شدہ اور ایک بیٹے کے باپ تھے (خروج ۲: ۲۱۔۲۲، ایضاً ۳: ۱۱۔۱۵) لیکن اہل کتاب اور مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ سمسونؑ کا درجہ حضرت موسیٰؑ سے بڑھ کر ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ بہ مطابق اناجیل معجزات سے کسی نبی کی فضیلت (معاذ اللہ) سرے سے ثابت ہی نہیں ہوتی مثلاً انجیل متی میں ہے ''کیونکہ جھوٹے

مسیح اور جھوٹے نبی اٹھ کھڑے ہوں گے اور ایسے بڑے نشان اور عجیب کام کر دکھائیں گے کہ اگر ممکن ہو تو برگزیدوں کو بھی گم راہ کر لیں'' (متی ۲۴:۲۴) تو اگر حضرت عیسیٰؑ کے گہوارے میں کلام کرنے کا معجزہ عیسائیوں کے نزدیک بھی درست ہو تو انجیل متی کے مذکورہ بالا مضمون کی رو سے اس سے حضرت یسوعؑ کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا دیگر انبیاء علیہم السلام پر فضیلت کیسے ثابت ہوگی؟ حضرت یسوعؑ کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا بھی آپ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بائبل کے پرانے عہدنامے کی کتاب پیدائش اور کتاب سلاطین دوم کی رو سے حضرت حنوکؑ اور حضرت ایلیاہؑ بھی آسمان پر چڑھے تھے (پیدائش ۵:۲۴۔ سلاطین دوم ۲:۱۱) جب حضرت یسوعؑ زمین پر زندہ موجود تھے تو ملائکہ مقربین اس وقت بھی آسمان پر تھے لیکن کوئی بھی ان ملائکہ کو حضرت یسوعؑ سے افضل قرار نہیں دیتا۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے زمین پر چلتا پھرتا ہے جب کہ پرندے فضا میں اڑتے ہیں اس سے پرندوں کا انسانوں سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بہ مطابق اناجیل حضرت یسوعؑ کی موت صلیب پر ہوئی تھی اور آپ تین دن تک قبر میں مدفون رہنے کے بعد دوبارہ جی اٹھے تھے۔ گو ہمارے نزدیک یہ محرف اناجیل کے جھوٹے مضامین ہیں لیکن ہمارے عیسائی بھائیوں کے خیال میں حضرت یسوعؑ موت کی حالت میں تین دن تک زیر زمین رہے تھے، حالانکہ ملائکہ مقربین اس وقت بھی آسمان پر زندہ موجود تھے لیکن کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ ان ایام میں ملائکہ حضرت یسوعؑ سے افضل ہو گئے تھے لہٰذا اس طرح کا استدلال باطل ہے کہ چونکہ حضرت یسوعؑ آسمان پر زندہ ہیں لہٰذا وہ زمین میں مدفون حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سمیت دیگر سب انبیاء سے افضل ہیں۔ یہ باتیں کسی کے دوسروں سے افضل ہونے یا نہ ہونے کا ہرگز معیار نہیں ہیں۔

۱۱۔ (ج) کتاب حزقی ایل ۳۷:۱۔۱۱

۱۲۔ (الف سلاطین دوم ۶:۱۷۔۲۰ (ب) سلاطین اول ۱۷:۱۳۔۱۶ (ج) خروج ۱۴:۲۱۔۲۲

۱۳۔ (الف) مجلّہ السیرۃ ششماہی شمارہ ۱۸، رمضان المبارک ۱۴۲۸ھ/ستمبر ۲۰۰۷ء صفحہ ۱۵۸ (ب) یوحنا ۵:۱۹ (ج) ایضاً ۸:۲۸۔۲۹

۱۴۔ (الف) ایضاً ۱۱:۴۱۔۴۲ (ب) مرقس ۸:۱۱۔۱۲ (ج) قرآن کریم: الانعام۔۱۱۰

۱۵۔ (الف) القمر: ۱۔۲ (ب) صحیح بخاری کتاب مناقب الانصار، باب انشقاق القمر۔ صحیح مسلم صفۃ القیامۃ باب انشقاق القمر (ج) کتاب یشوع ۱۰:۱۲۔۱۴

۱۶۔ (الف) الانفال: ۱۷ (ب) الاسراء: ۱ (ج) کتاب سلاطین دوم ۲:۱۱

۱۷۔ (الف) انجیل مرقس ۱۶:۱۹۔ سورۃ النساء: ۱۵۸ (ب) طٰہٰ: ۱۳۳ (ج) کتاب پیدائش ۲۰:۱۲

۱۸۔ (الف) کتاب احبار ۱۸:۹ (ب) کتاب استثناء ۲۷:۲۲ (ج) احبار ۲۰:۱۷ (د) پیدائش ۲۹:۱۵۔۳۰

۱۹۔ (الف) ایضاً ۱۸:۱۸ (ب) خروج ۶:۲۰ (ج) احبار ۱۸:۱۲

۲۰۔ (الف) استثناء ۲۳:۲ (ب) پیدائش ۲۲:۱۲ (ج) ایضاً ۲۲:۱۳

۲۱۔ (الف) استثناء ۲۴:۱۔۲ (ب) انجیل متی ۱۹:۸۔۹ (ج) ایضاً ۵:۲۷۔۲۹

۲۲۔ (الف) ایضاً ۵:۳۳۔۳۴ (ب) کتاب گنتی ۱۵:۳۲۔۱۶ (ج) متی ۱۲:۱۰۔۱۲

۲۳۔ (الف) آل عمران:۵۰ (ب) انجیل متی ۵:۱۷۔۱۸ (ج) کتاب یرمیاہ ۳۱:۳۱

۲۴۔ (الف) المائدہ:۳ (ب) انجیل متی ۵:۱۹۔۲۰ (ج) مرقس ۱۰:۱۷۔۱۹

۲۵۔ (الف) متی ۱۹:۱۶۔۱۹، لوقا ۱۸:۱۸۔۲۰ (ب) لوقا ۲:۲۱ (ج) متی ۲۴:۱۷۔۱۸

۲۶۔ (الف) کتاب اعمال ۱۵:۲۸۔۲۹ (ب) مجلہ السیرۃ عالمی، شمارہ ۱۹، ربیع الاول ۱۴۲۹ھ/ مارچ ۲۰۰۸ء صفحہ ۱۵۹ (ج) عبرانیوں ۸:۷

۲۷۔ (الف) گلتیوں ۳:۱۳ (ب) ایضاً ۱:۱۱۔۱۲ (ج) کتاب استثناء ۲۱:۲۲۔۲۳

۲۸۔ (الف) احبار ۲۴:۱۱۔۱۶، ایضاً ۲۰:۹ (ب) ایضاً ۱۱:۷۔۸ (ج) طیطس ۱:۱۵

۲۹۔ (الف) رومیوں ۱۴:۱۴ (ب) ا۔ تیمتھیس ۴:۴۔۶ (ج) احبار ۱۱:۴

۳۰۔ (الف) ایضاً ۱۱:۵۔۶، ۱۳:۶۔۱۹ (ب) قرآن کریم، المائدہ:۴۴ (ج) قرآن کریم، القصص ۴۹

۳۱۔ (الف) الانعام:۹۱، ۹۲ (ب) ایضاً:۹۳ (ج) رومیوں ۳:۷

۳۲۔ (الف) سموئیل اول ۱۵:۱۱ (ب) ایضاً ۱۵:۳۵ (ج) ایضاً ۱۶:۱

۳۳۔ (الف) ایضاً ۱۶:۱۳ (ب) البقرہ:۱۰۶، ۱۰۷ (ج) الحج:۲۷، ۲۸

۳۴۔ (الف) المائدہ:۴۸ (ب) البقرہ:۱۴۲ (ج) کتاب خروج ۳۱:۱۲۔۱۳

۳۵۔ (الف) گلتیوں ۲:۱۱۔۱۳ (ب) ایضاً ۱:۱۵۔۱۷ (ج) متی ۵:۱۸

۳۶۔ (الف) متی ۵:۲۱۔۴۸ (ب) مجلہ السیرۃ شمارہ ۱۸ ستمبر ۲۰۰۷ء ص ۱۰۱۔۱۲۰، ۱۷۵۔۱۸۲ (ج) النساء:۸۲

۳۷۔ (الف) التحریم ۱۲ (ب) ص:۷۲ (ج) النساء:۱۷۱

۳۸۔ (الف) آل عمران:۵۹ (ب) کتاب پیدائش ۲:۷ (ج) حٰمٓ السجدہ:۵

۳۹۔ (الف) المعارج:۴ (ب) المزمل:۹ (ج) الرحمٰن:۱۷

۴۰۔ (الف) المعارج:۴۰ (ب) محمد:۲۴ (ج) الکہف:۵۰

۴۱۔ (الف) البقرہ:۳۴ (ب) طٰہٰ:۸۵ (ج) مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ قصص القرآن ج ۱، ص ۵۰۱، مکتبہ مدینہ اردو بازار، لاہور

۴۲۔ (الف) الکہف:۲۵، ۲۶ (ب) مریم:۲۸ (ج) التحریم:۱۲

۴۳۔ (الف) القصص:۳۸ (ب) کتاب آستر ۳:۱ (ج) مثلاً الاعراف:۵۴

۴۴۔ (الف) حٰمٓ سجدہ:۹، ۱۲ (ب) صحیح بخاری تفسیر سورہ حٰمٓ سجدہ (ج) البقرہ:۲۹

۴۵۔ (الف) النازعات:۲۷، ۳۳ (ب) الانعام:۱۴ (ج) الاعراف:۱۴۳

۴۶۔ (الف) لقمان:۳۴ (ب) روم:۴۰ (ج) یٰسٓ:۷۷

۴۷۔ (الف) الفرقان:۵۴ (ب) النساء:۷۸، ۷۹ (ج) الزمر:۴۲

۴۸۔ (الف) السجدہ:۱۱ (ب) الانعام:۶۱ (ج) الانفال:۵۰

۴۹۔ (الف)الرحمٰن:۳۹(ب)الحجر:۹۲(ج)النساء:۴۲

۵۰۔ (الف)الانعام:۲۳(ب)یٰس:۶۵(ج)المومنون:۱۰۱

۵۱۔ (الف)الصافات:۵۰(ب)الزمر:۶۸(ج)البقرہ:۲۵۶

۵۲۔ (الف)ایضاً:۱۹۳(ب)کتاب خروج ۲۲:۲۰(ج)ایضاً ۳۲:۲۷۔۲۸

۵۳۔ (الف)الانعام:۷۳(ب)آل عمران:۱۴۲(ج)طٰہٰ:۴۴

۵۴۔ (الف)طٰہٰ:۶۲(ب)الدھر:۴(ج)النمل:۲۲

۵۵۔ (الف)النساء:۱۶۲(ب)المائدہ:۵(ج)کتاب تواریخ اول ۱۴:۳

۵۶۔ (الف)سموئیل دوم ۵:۱۳(ب)سلاطین اول ۱۱:۳(ج)کتاب پیدائش ۱۶:۳

۵۷۔ (الف)ایضاً ۲۵:۱(ب)ایضاً ۳۵:۲۳۔۲۶(ج)ایضاً ۳۰:۳،۴،۹

۵۸۔ (الف)ایضاً ۲۹:۱۵۔۳۰(ب)کتاب استثناء ۲۱:۱۵(ج)کتاب قضاۃ ۸:۳۰

۵۹۔ (الف)تواریخ دوم ۱۱:۲۱(ب)ایضاً ۱۳:۲۱(ج)انجیل متی ۲۵:۱۔۱۰

۶۰۔ (الف)متی ۱۹: ۵۔۹ (ب)The True Message of Christ by Ameena Bilal Philips (Page 90) F.G al Az-Zulfi (Saudi Arabia) with reference to "Polygamy Reconsidered" Page 140:- African Plural Marriages The Ibid w.r.t. "Polygamy (ج)Christian Churehes, New york: Orbis Books 1975 Reconisdered Page 17

۶۱۔ (الف)ibid w.r.t. "Women in Juadism" Page 148.(ب)النساء:۳(ج)کتاب خروج، باب ۲۸

۶۲۔ (الف)الاحزاب:۵۰(ب)ایضاً:۵۳(ج)ایضاً:۵۱

۶۳۔ (الف)جمع الفوائد (دار الکتب العلمیۃ بیروت، طبع اول ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ میلادی): ج۱،ص ۴۳۴، رقم ۴۲۵۷۔ابی داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ (ب)جمع الفوائد: ج۱،ص ۴۱۷، رقم ۴۰۹۰ (ج)مشکوٰۃ المصابیح:ص ۲۶۷

۶۴۔ (الف)صحیح بخاری: ج۲،ص ۹۵۶ (ب)ایضاً (ج)الاحزاب:۲۸،۲۹

۶۵۔ (الف)ایضاً:۳۷(ب)ایضاً:۵(ج)صحیح بخاری تفسیر سورہ التحریم

۶۶۔ (الف)التحریم:۱،۲(ب)المائدہ:۸۹(ج)متی ۱۵:۲۲۔۲۸

۶۷۔ (الف)کتاب پیدائش ۲۹:۱۱(ب)ایضاً ۲۹:۱۶۔۲۰(ج)ایضاً ۲۹:۲۱۔۳۰، ایضاً ۳۰:۳،۴،۹،۱۰

۶۸۔ (الف)ایضاً ۳۰:۱۹۔۲۳،۲۶۔۳۵(ب)ایضاً ۳۵:۹۔۱۰(ج)اعراف:۴۳(د)سموئیل اول ۱۱:۲۔۲۷

۶۹۔ (الف)سموئیل اول ۱۸:۲۶۔۲۷(ب)سموئیل دوم ۳:۱۳۔۱۶(ج)سموئیل اول ۱۶:۱۳

۷۰۔ (الف)سلاطین اول ۳:۶(ب)سموئیل دوم ۲۳:۱۔۳(ج)کتاب اعمال ۲:۲۹۔۳۱

۷۱۔ (الف)عبرانیوں ۱۱:۳۲(ب)کتاب زبور ۲:۷(ج)سلاطین دوم ۲۲:۲

۷۲۔ (الف) سلاطین اول ۳:۱۲ (ب) ایضاً ۶:۱۱۔۱۲ (ج) لوقا ۷:۳۶۔۳۹

۷۳۔ (الف) انجیل یوحنا ۱۱:۱۔۵ (ب) پیدائش ۱۹:۳۰۔۳۸ (ج) پطرس کا دوسرا خط ۲:۷

۷۴۔ (الف) کتاب قضاۃ ۱۶:۱ (ب) ایضاً باب ۱۶ (ج) ایضاً ۱۳:۵

۷۵۔ (الف) کتاب گنتی ۳۱:۱۷۔۱۸ (ب) التحریم: ۵ (ج) ابن حجر عسقلانیؒ/ الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ: ج ۴، ص ۳۳۸ تحت ''سودۃ بنت زمعۃ.....''

۷۶۔ (الف) ایضاً: ج ۴، ص ۳۳۸، ۳۳۹ (ب) سموئیل دوم ۲۰:۳ (ج) جمع الفوائد: ج ۱، ص ۴۱۴، رقم ۴۰۶۳، ۴۰۶۶

۷۷۔ (الف) مسند امام احمد بن حنبلؒ: ج ۶، ص ۲۱۰، ۲۱۱ (ب) الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ: ج ۴، ص ۳۵۹ (ج) مشکوٰۃ المصابیح: ص ۲۷۱

۷۸۔ (الف) سیرۃ المصطفیٰ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ فرید بک ڈپو۔ اردو مارکیٹ۔ جامع مسجد دہلی طبع ۱۹۹۹ء: ج ۱، ص ۸۷۔ بہ حوالہ عیون الاثر (ب) ابن ہشام/ السیرۃ النبویۃ: ج ۱، ص ۱۹۸ حاشیہ ۳ بہ حوالہ شرح المواہب والاستیعاب (ج) مروان نجک/ تہذیب سیرۃ ابن کثیر۔ دارطیبۃ الریاض (سعودی عرب) طبع اول ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ میلادی: ص ۹۱

۷۹۔ (الف) الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ: ج ۴، ص ۳۷۷ (ب) قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ/ رحمۃ اللعالمین: ج ۲، ص ۱۱۹، دارالاشاعت اردو بازار، کراچی طبع اول ذوالحجہ ۱۴۱۱ ہجری (ج) ایضاً ۲/ ۱۱۷ حاشیہ

۸۰۔ (الف) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۲۰۰، رقم ۱۲۹۷ (ب) مشکوٰۃ المصابیح: ص ۲۸۲ (ج) ایضاً: ص ۲۸۰

۸۱۔ (الف) سیرۃ ابن ہشام: ج ۱، ص ۲۷۱ (ب) جمع الفوائد: ج ۱، ص ۴۱۴ حدیث رقم ۴۰۶۳ (ج) مشکوٰۃ المصابیح: ص ۲۸۰

۸۲۔ (الف) ایضاً: ص ۲۸۱ (ب) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۵۷، رقم ۶۴۱۷ (ج) سنن ابن ماجہ: ص ۲۸۹

۸۳۔ (الف) مشکوٰۃ المصابیح: ص ۵۷۲ (ب) سنن ابن ماجہ: ص ۲۸۹ (ج) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۱۵۷، رقم ۶۸۹۲

۸۴۔ (الف) ابن ماجہ: ص ۲۸۹ حاشیہ ۶ (ب) جلاء العیون: ج ۱، ص ۳۰۷ (ج) ایضاً: ج ۱، ص ۲۱۷، ۲۱۸

۸۵۔ (الف) صحیح بخاری: ج ۱، ص ۵۰۱ (ب) مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ/ حیات الصحابۃ: ج ۲، ص ۵۲۹، عن ابن سعد بہ حوالہ کنز الدقائق: ج ۳، ص ۱۳۲۔۸۵ (ج) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۳۵۱، رقم ۸۴۲۳

۸۶۔ (الف) جمع الفوائد: ج ۱، ص ۳۳۶، رقم ۳۳۴۹ (ب) ابوریحان البیرونیؒ/ آلاثار الباقیہ کا انگریزی ترجمہ دی کرونولوجی آف دی اینشنٹ نیشنز: ص ۷۳، ۷۴۔ انٹرنیشنل ہجرہ کونسل طبع ۱۹۸۳ء (ج) ایضاً: ص ۱۴۱، ۶۹، ۷۰

۸۷۔ (الف) رحمۃ للعالمین قاضی منصور پوریؒ: ج ۲، ص ۳۹۹ (ب) تہذیب سیرۃ ابن کثیر: ص ۵۰۷ (ج) طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۱۰۶۔ المغازی للواقدی: ج ۲ ل ص ۶۳۴۔ سیرۃ ابن ہشام: ج ۳، ص

۳۴۲۔ المحبر لابن حبیب البغدادی: ص ۱۱۵

۸۸۔ (الف) طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۱۵۶ (ب) جمع الفوائد: ج ۱، ص ۳۳۳، رقم ۳۳۱۹، ۳۳۲۳، ۳۳۲۴ (ج) ایضاً: ج ۱، ص ۳۷۰، رقم ۳۶۳۴

۸۹۔ (الف) ایضاً: ج ۱، ص ۲۹۵، رقم ۲۹۰۳ (ب) صحیح بخاری: ج ۱، ص ۶۱ (ج) ایضاً: ج ۱، ص ۶۶۰

۹۰۔ (الف) ایضاً: ج ۱، ص ۵۵۵ (ب) سیرۃ ابن ہشام: ج ۲، ص ۲۳۷ (ج) زرقانیؒ / شرح مواہب ۱: ص ۳۲۵ (د) تہذیب سیرۃ ابن کثیر: ص ۲۲۸

۹۱۔ (الف) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۴۵۴، رقم ۹۰۰۷۔۹۰۰۸ (ب) ایضاً (ج) ایضاً: ج ۲، ص ۴۵۲، رقم ۸۹۹۸

۹۲۔ (الف) ایضاً: ج ۱، ص ۱۴۹، رقم ۱۴۷۵ (ب) سورہ ھود: ۴۳ (ج) طٰہٰ: ۱۰

۹۳۔ (الف) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۴۵۴، رقم ۹۰۱۳ (ب) ایضاً: ج ۲، ص ۴۵۳، رقم ۹۰۰۲۔ للطبرانی بارسال (ج) ایضاً: ج ۲، ص ۴۵۳، رقم ۹۰۰۳۔ لاحمد مطولا، وحدیث رقم ۹۰۰۴ للطبرانی فی المعجم الکبیر

۹۴۔ (الف) سورہ نوح: ۲۸ (ب) الاحزاب: ۳۳ (ج) ایضاً: ۴۳

۹۵۔ (الف) راغب اصفہانی / المفردات فی غریب القرآن ص ۳۱ (ب) سورۂ مومن: ۲۸ (ج) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۴۵۴، رقم ۹۰۰۶ (د) سورہ الاحزاب: ۴۰

۹۶۔ (الف) کتاب استثناء ۳۱: ۲۴۔۲۶ (ب) ایضاً ۳۱: ۹۔۱۲ (ج) کتاب قضاۃ ۲: ۱۰۔۱۴

۹۷۔ (الف) سلاطین دوم ۲۲: ۳، ۸، ۱۰۔۱۱ (ب) کتاب یرمیاہ ۶: ۱۳ (ج) ایضاً ۲۳: ۱۵۔۱۶

۹۸۔ (الف) ایضاً ۲۳: ۳۶ (ب) ایضاً ۲۳: ۱۱ (ج) ایضاً ۴: ۸۔۱۰

۹۹۔ (الف) کتاب احبار ۲۴: ۱۶ (ب) یرمیاہ ۲۳: ۱۶۔۱۷ (ج) سلاطین اول ۱۳: ۱۱۔۲۹

۱۰۰۔ (الف) حزقی ایل ۱۴: ۹ (ب) سلاطین اول ۲۲: ۱۹۔۲۳، تواریخ دوم ۱۸: ۱۸۔۲۲ (ج) تواریخ دوم ۱۸: ۵، سلاطین اول ۲۲: ۶

۱۰۱۔ (الف) یرمیاہ ۳۹: ۱۔۹ (ب) تواریخ اول ۷: ۶ (ج) ایضاً ۸: ۱۔۲

۱۰۲۔ (الف) پیدائش ۴۶: ۲۱ (ب) بائبل سے قرآن تک (اردو ترجمہ اظہار الحق مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ): ج ۲، ص ۲۸ شاہد نمبر ۱۶، مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع دوم ربیع الاول ۱۴۰۳ھ، بہ حوالہ تفسیر بائبل ریورنڈ آدم کلارک، طبع ۱۸۹۱ء، بہ سلسلۂ تفسیر تواریخ اول ۷: ۶ (ج) پیدائش ۳۶: ۳۰

۱۰۳۔ (الف) سموئیل اول: باب ۸ (ب) استثناء ۳: ۱۴ (ج) گنتی ۳۲: ۴۰

۱۰۴۔ (الف) تواریخ اول ۲: ۲۲ (ب) گنتی: ۲۱: ۳ (ج) قضاۃ ۱: ۱۷

۱۰۵۔ (الف) ایضاً ۱: ۳ (ب) خروج ۱۶: ۳۵ (ج) یشوع ۵: ۱۱۔۱۲

۱۰۶۔ (الف) ایضاً ۴: ۱۴ (ب) پیدائش ۱۳: ۱۸، ایضاً ۳۵: ۳۷، ایضاً ۳۷: ۱۴ (ج) قضاۃ ۱۸: ۲۹

۱۰۷۔ (الف) پیدائش ۱۴: ۱۴ (ب) استثناء ۱: ۱۔۵ (ج) ایضاً ۳۴: ۱۰۔۱۲

۱۰۸۔ (الف) یہوداہ کا خط ۱: ۹ (ب) تیمتھیس ۳: ۸ (ج) یہوداہ کا خط ۱: ۱۴۔۱۵

۱۰۹۔ (الف) ایضاً ۱:۶ (ب) پطرس کا دوسرا خط ۲:۴ (ج) مثلاً انجیل متی ۴:۱۔۱۱

۱۱۰۔ (الف) کرنتھیوں ۱۵:۶ (ب) گنتی ۲۱:۱۴ (ج) یشوع ۱۰:۱۳

۱۱۱۔ (الف) سموئیل اول ۱۰:۲۵ (ب) سلاطین اول ۴:۳۲۔۳۳ (ج) ایضاً ۱۱:۴۱

۱۱۲۔ (الف) تواریخ اول ۲۹:۲۹۔۳۰ (ب) تواریخ دوم ۱۲:۱۵ (ج) ایضاً ۹:۲۹

۱۱۳۔ (الف) ایضاً ۲۰:۳۴ (ب) ایضاً ۲۶:۲۲ (ج) ایضاً ۳۲:۳۲

۱۱۴۔ (الف) ایضاً ۳۵:۲۵ (ب) کتاب نحمیاہ ۱۲:۲۳ (ج) مجلہ السیرۃ عالمی شمارہ ۱۹ ص ۱۴۹۔۱۵۲

۱۱۵۔ (الف) ایضاً: ص ۱۳۹۔۱۴۱ (ب) سورہ یونس: ۵۷، ۵۸ (ج) طٰہٰ: ۱۱۴

۱۱۶۔ (الف) القیامۃ: ۱۶، ۱۸ (ب) جمع الفوائد: ۲۳۴۲، رقم ۷۳۸۰، ۷۳۸۲ (ج) العنکبوت: ۴۹

۱۱۷۔ (الف) الجزریؒ/ النشر فی القرائت: العشر ج ۱، ص ۶ (ب) ابن کثیرؒ/ البدایۃ والنہایۃ: ج ۴، ص ۷۳۔ دار الحدیث القاہرہ (مصر) طبع اول ۱۴۱۳ ہجری/ ۱۹۹۲ میلادی (ج) زرکشیؒ/ البرہان فی علوم القرآن ۱/ ۲۴۱۔۲۴۳ (د) جمع الفوائد: ج ۱، ۷۰، حدیث رقم ۱۶۸۹

۱۱۸۔ (الف) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۴۵، رقم ۶۳۷۴ (ب) ایضاً: ج ۲، ص ۴۶، رقم ۶۳۷۷ (ج) علامہ محمود آلوسی بغدادی/ تفسیر روح المعانی: ج ۱، ص ۲۶، مکتبہ رشیدیہ۔ لاہور

۱۱۹۔ (الف) المزمل: ۲۰ (ب) البدایۃ والنہایۃ: ج ۳، ص ۱۴۱ (ج) ایضاً: ج ۵، ص ۳۲۲۔۳۳۷

۱۲۰۔ (الف) ایضاً: ج ۳، ص ۱۲۸ (ب) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۱۳۴، رقم ۶۷۲۵ (ج) ایضاً: ج ۲، ص ۱۴۰ رقم ۶۷۷۳۔ للطبرانی فی المعجم الکبیر

۱۲۱۔ (الف) ابن حجر عسقلانی/ فتح الباری شرح بخاری: ج ۹، ص ۱۸، بہ حوالہ مسند احمد و سنن اربعہ (ب) علامہ سید شمس الحق افغانی/ علوم القرآن: ص ۱۱۷، مکتبہ الحسن۔ اردو بازار، لاہور (ج) علامہ جلال الدین سیوطیؒ/ الاتقان فی علوم القرآن اٹھارویں نوع

۱۲۲۔ (الف) النشر فی القرائت الحشر: ج ۱، ص ۷۔ البدایۃ والنہایۃ: ج ۶، ص ۳۱۸ (ب) البدایۃ والنہایۃ: ج ۶، ص ۳۲۸، ۳۳۴ (ج) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۲۳۹، رقم ۷۴۳۳

۱۲۳۔ (الف) مثلاً سورہ البقرہ: ۱۲۹ (ب) الاتقان فی علوم القرآن: ج ۱، ص ۶۰ (ج) مولانا محمد تقی عثمانی/ علوم القرآن: ص ۱۸۶، مکتبہ دار العلوم کراچی طبع ششم ۱۴۰۶ھ، بہ حوالہ تاریخ القرآن از عبد الصمد صارم: ص ۴۳ مطبوعہ لاہور (۱۹۶۳ء)

۱۲۴۔ (الف) ایضاً: ص ۱۱۲۔ بہ حوالہ الاتقان: ج ۱، ص ۵۹ (ب) الاتقان فی علوم القرآن: ج ۱، ص ۶۰ (ج) مولانا محمد تقی عثمانی/ علوم القرآن: ص ۱۸۶، مکتبہ دار العلوم کراچی طبع ششم ۱۴۰۶ھ، بہ حوالہ تاریخ القرآن از عبد الصمد صارم: ص ۴۳ مطبوعہ لاہور (۱۹۶۳ء)

۱۲۵۔ (الف) النشر فی القرأت الحشر: ج ۱، ص ۲۰ (ب) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۲۳۵، ۲۳۶، رقم ۷۳۹۰، ۷۳۹۱ (ج) تفسیر روح المعانی: ج ۱، ص ۲۰

۱۲۶۔ (الف) علوم القرآن مولانا محمد تقی عثمانی: ص ۱۰۸، ۱۰۹ (ب) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۲۴۰، رقم ۷۴۳۴، ۷۴۳۶ (ج) ایضاً۔

۱۲۷۔ (الف) تفسیر روح المعانی: ج ۲۱، ص ۱۵۲ (ب) ایضا: ج ۱، ص ۲۳ حاشیہ (ج) مناھل العرفان: ج ۱، ص ۲۵۴،۲۵۳

۱۲۸۔ (الف) روح المعانی: ج ۱، ص ۲۲، ۲۳ (ب) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۲۴۰، رقم ۷۴۳۷ (ج) علوم القرآن علامہ شمس الحق افغانیؒ: ص ۱۰۹

۱۲۹۔ (الف) فتح الباری: ج ۹، ص ۱۳۔۱۵ (ب) جمع الفوائد: ج ۲، ص ۲۴۰، رقم ۷۴۳۸۔۷۴۳۹ (ج) ایضاً: ج ۲، ص ۲۳۲، رقم ۷۳۶۱۔۷۳۶۲

۱۳۰۔ (الف) سورۃ الاعلیٰ: ۶ (ب) البقرہ: ۱۰۰ (ج) علوم القرآن مولانا محمد تقی عثمانی: ص ۲۳۱ بہ حوالہ مسند امام احمد بن حنبلؒ حصہ زوائد، مسندات عائشہؓ: ج ۶، ص ۲۵۹، دار صادر۔ بیروت (لبنان)

۱۳۱۔ (الف) تنبیہ الحائرین: ص ۱۳۰ مولانا عبدالشکور لکھنویؒ۔ المکتبۃ الاشرفیہ۔ جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ۔ لاہور طبع دسمبر ۱۹۸۸ء بہ حوالہ المعجم الاوسط للطبرانی عن ابن مسعودؓ بسند حسن (ب) ایضاً: ص ۱۳۲۔۱۳۴۔ بہ حوالہ الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی: ج ۲، ص ۸۱۔ المحلّٰی لابن حزم: ج ۱، ص ۱۳، فواتح الرحموت شرح مُسلّم الثبوت: ج ۲، ص ۱۲

۱۳۲۔ (الف) روح المعانی: ج ۱، ص ۲۸ (ب) سورہ محمد: ۳۰ (ج) کتاب استثناء ۳۱: ۹۔۱۲

۱۳۳۔ (الف) النساء: ۱۱۵ (ب) الحجر: ۹ (ج) حٰمٓ السجدہ: ۴۲

۱۳۴۔ (الف) سبا: ۴۶ (ب) المومنون: ۷۰۔۷۱ (ج) الحج: ۴۶

۱۳۵۔ (الف) الرعد: ۱۹ (ب) الاسراء: ۷۲ (ج) طٰہٰ: ۱۲۴۔۱۲۷

نعت اور آدابِ نعت گوئی کے حوالے سے عمدہ نثر پاروں کا انتخاب

نعت میں کیسے کہوں

پروفیسر محمد اقبال جاوید

قیمت: ۲۰۰ صفحات: ۱۶۸

نعت ریسرچ سینٹر

۵۰۔بی۔سیکٹر ۱۱/اے۔نارتھ کراچی۔۷۵۸۵۰

توسیع دعوت نبوی ﷺ اور عداوت قریش کا ارتقا

ڈاکٹر نثار احمد

(۱)

مخالفت وعداوتِ قریش کا دوسرا مرحلہ تاریخ کی روشنی میں (زمان ومکان کی تبدیلی کے ساتھ) اُس وقت شروع ہوا جب کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم (۶۲۲ء/۱ھ میں) ہجرت فرمانے کے بعد مدینہ طیبہ میں اقامت گزیں ہوگئے۔ جہاں اہلِ مدینہ نے بیعت عقبۂ کبیرہ کے معاہدۂ عمرانی منعقدہ ذی الحجہ ۱۲ نبوی/ جون ۶۲۲ء کی تعمیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے امام وپیشوا، نبی ورسول منتظر، سربراہ مجتمع اسلامی اور حکمرانِ ریاست مدینہ کی حیثیت سے استقبال کیا تھا۔ تاہم مخالفت وعداوتِ قریش کا سلسلہ اپنی جدا نوعیت اور کیفیت وکمیت نیز موقع ومحل کی نیرنگیوں کے ساتھ اگلے آٹھ سالوں تک مزید چلتا رہا۔ یہاں تک کہ مؤرخین کے عمومی بیان کے مطابق رمضان ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء میں فتح مکہ مکرمہ پر انجام پذیر ہوا۔ (۱) جب کہ اس کے مقابل توسیع دعوتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تسلسل ہجرت مدینہ کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ جاری وساری رہا بلکہ فتح مکہ کے بعد بھی سرافرازیٔ رفتار کے ساتھ اگلے مزید دو سالوں میں اتمام واکمال کی منزل سے ہم کنار ہوا۔ علاوہ ازیں اھ میں قائم ہونے والی ریاست نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار اپنی وسعتوں میں ۱۰ھ تک سرزمین عرب کے گوشے گوشے تک پہنچ گیا۔ آخر کار ربیع الاول ۱۱ھ/ جون ۶۳۲ء میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے پردہ فرمایا تو آپ کا مشن ہر طرح مکمل اور ادیانِ باطلہ پر دینِ حق (اسلام) کا غلبہ مستحکم ہو چکا تھا۔

(۲)

صورتِ حال میں اس وقت تک تغیر ہی نہیں انقلاب آچکا تھا۔ قریشِ مکہ کی طاقت اگرچہ اب بھی وہی تھی، قوت واقتدار کا نشہ، مجاورانِ کعبۃ اللہ کی حیثیت سے مرتبہ ومنزلت آبا واجداد کے دین سے وابستگی، بتوں سے محبت، معبودانِ باطل کا اعتبار پہلے کی طرح قائم تھا۔ البتہ اسلام دشمنی، دین الٰہی سے نفرت، رسالت محمدی سے عناد، حضور ختمی مرتب ہاشمی ومطلبی سے بغض اور اہلِ ایمان سے عداوت پہلے سے

بہت زیادہ بڑھ چکی تھی اس کی صاف وجہ یہ پے در پے ناکامیاں تھیں، مثلاً یہ کہ قریش مکہ اپنی تمام تر کوششوں ظلم وستم اور طاقت کے بھرپور استعمال کے باوجود اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل نہ کر سکے، حتیٰ کہ اپنے منصوبہ قتل کو بھی عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے اور حد یہ ہوگئی کہ مکہ مکرمہ سے سیکڑوں میل دور راہِ ہجرت میں جانے والے چار رکنی مختصر ترین قافلۂ نبوی کا تعاقب بھی نہ کر سکے۔ اس بات پر وہ پیچ وتاب پہلے ہی کھا رہے تھے کہ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں مسلمان پہلے ہی اُن کے دستِ تظلم سے بچ کر مدینہ طیبہ پہنچ چکے تھے اور اب غضب یہ ہوا کہ اُن کا اصل دشمن اور سب سے زیادہ مطلوب شخص بھی اُن کی دست رس سے باہر چلا گیا، تو ان کا غصہ ان کا غیظ وغضب اور جھنجھلاہٹ عروج پر پہنچ گئی اور کچھ بھی کر ڈالنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

قریش مکہ چوں کہ واقعۂ ہجرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مدینے کی پرانی معاشرتی وسماجی حالت، وہاں کے مزاج، قبائلی رنجشوں اور امن وامان کے دگرگوں حالات سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ وہاں کے مختلف النوع عناصر عبداللہ بن ابی کی قیادت وسیادت پر متفق ہو چکے ہیں اور محض رسمی تاج پوشی کا انعقاد باقی ہے اس لئے وہ اس زعم باطل میں مبتلا ہو گئے کہ جب چاہیں گے ہاتھ سے نکل جانے والے نئے دین کے متوالوں کو عبداللہ بن ابی کے ذریعے پکڑ والیں گے اور سزا خود دیں لیں گے۔ اس کا اندازہ قریش کے اس خط سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے (مولانا شبلی کے بہ قول ہجرت رسول کے چند روز بعد ہی) عبداللہ بن ابی کو لکھا تھا۔ اس خط کا مضمون مولانا شبلی نے اپنی کتاب سیرت النبی میں سنن ابی اوٗد کے حوالے سے نقل کیا ہے جب کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے حاشیے میں بخاری کا حوالہ بھی دیا ہے قریش نے دھونس دھمکی کے ساتھ لکھا تھا کہ

> تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینے سے نکال دو۔ ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کر دیں گے اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔ (۲)

خط کے مندرجات اور اس کے زہریلے الفاظ بتا رہے ہیں کہ قریش پر اپنی طاقت کا نشہ، غرور وگھمنڈ اور تفوق وبرتری کا خبط کتنا زیادہ چڑھا ہوا تھا۔ اپنے طور پر انہیں پوری توقع تھی کہ عبداللہ بن ابی کی طرف سے تعمیل حکم ضرور کی جائے گی (۳) مگر انہیں یہ قطعی اندازہ نہ تھا کہ زمانہ قریب میں (بیعت ہائے عقبہ کے بعد) مدینہ کے زمینی حقائق بالکل بدل چکے ہیں اور وہاں کے معاشرتی حالات میں انقلاب آچکا ہے۔ انہیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ اسلام کی برکت سے برسرِ پیکار گروہ شیر وشکر ہو چکے ہیں۔ نزاج کی جگہ (آمد رسول